

نائیوٹ

دنیا کو دیکھنے کا میرا زاویہ
ایک ڈائری
2025

عبدالمعیط

نائیوت

2025/02/09

"کبھی بھی اپنے اندر کے سوالات کو مت دبائیں"

مجھے ایک بات سمجھ نہیں آتی کہ پتہ نہیں لوگ کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ مشکل قسم کی اصطلاحات بولیں گے، کتابوں میں مشکل الفاظ لکھیں گے تو وہ کوئی بہت بڑے فنکار لگیں گے؟ بھلا اگر آپ کی بات کسی کو سمجھ ہی نہیں آئی تو اس کا کیا فائدہ؟ زبان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ آپ اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور دوسرا اسے سمجھ سکے۔ اگر آپ کے خیالات ہی اتنے الجھ جائیں کہ دوسرا انہیں سمجھ نہ سکے تو اس کا کیا فائدہ؟ میرا تو ماننا ہے کہ بات آسان بولو تاکہ اگلے بندے کو سمجھ آئے۔ اسی لیے جب بھی میں کچھ لکھتا ہوں تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنی بات کو آسان الفاظ میں بیان کروں اور ایسی زبان بولوں جو سامنے والے انسان کو سمجھ آئے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں کوئی بہت بڑا ادیب ہوں، میں بس ایک عام انسان ہوں۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد بس یہ ہے کہ ان لوگوں کو سمجھا سکوں جن کو میری طرح زندگی میں عجیب و غریب واقعات پیش آئے، جو عام طور پر ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مجھ سے عام طور پر میرے دوست وغیرہ سوال پوچھتے رہتے ہیں، کئی باتیں بہت نجی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ میرا مقصد ان سارے سوالات کو ایڈریس کرنا ہے جو میرے ساتھ ہوئے یا میرے کسی جاننے والے کے ساتھ، جو مجھ سے پوچھے گئے یا مجھے بتائے گئے۔ جب ایک انسان پیدا ہوتا ہے تب سے لے کر اپنی موجودہ عمر تک وہ اپنے ارد گرد کی چیزوں کو نوٹ کرتا رہتا ہے۔ نہ جانے ہر روز کتنے سوالات اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں اور کتنے مر جاتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان بہت سارے سوال پوچھتا ہے، مگر جب اسے جواب نہیں ملتے یا لوگ اسے منع کر دیتے ہیں تو وہ اپنی یہ

خوبی مار دیتا ہے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ آہستہ آہستہ اس کے اندر سوال پیدا ہونا بند ہو جاتے ہیں اور کئی چیزیں زندگی کی پوشیدہ رہ جاتی ہیں۔ کئی دفعہ انسان صرف اس لیے غلطی کرتا ہے کیونکہ اسے ان چیزوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔

مجھ سے شروع سے سب کو یہ شکایت رہی ہے کہ میں بڑے عجیب و غریب سوالات پوچھتا رہتا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے کہ ان سوالات کی وجہ سے ہی میں دوسروں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں اور یہ علم مجھے بہت فائدہ دیتا ہے۔ اس ساری گیم میں صرف لڑکے ہی شامل نہیں ہوتے، لڑکیاں بھی اس کا حصہ ہوتی ہیں، بلکہ لڑکیوں کے دلوں میں مردوں کے مقابلے میں زیادہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک لڑکا اور لڑکی پیدائش کے بعد کئی تبدیلیوں سے گزرتے ہیں، جس سے ان میں احساسات، خیالات، محبت، قربانی اور ریلیشن سے متعلق جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ انہیں محسوس کرتے ہیں، مگر کوئی ان کو یہ بات سمجھاتا نہیں اور نہ ہی وہ ڈر کی وجہ سے پوچھ پاتے ہیں۔

یہ سوال ان کے دل میں پڑے رہتے ہیں اور آہستہ آہستہ لوگوں کے لیے یہ چیزیں ڈپریشن کی وجہ بن جاتی ہیں۔ جب ایک بچہ ہم سے راستہ پوچھتا ہے اور ہم نہیں بتاتے اور اس کے اندر کی فیلنگز اسے تنگ کرتی رہتی ہیں، تو وہ اور لوگوں سے راستہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ غلط لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ میں یہ ساری باتیں بچوں سے شروع اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ یہ سب کچھ بچپن سے ہی ہونا شروع ہوتا ہے۔ آپ اپنی ذات میں ہی دیکھ لیں کہ کتنی چیزیں ایسی ہیں جو آسانی سے آپ کو پتہ چل گئیں؟ کیا آپ کبھی کسی غلط انسان کے ہاتھ نہیں لگے؟ کیا جو لوگ آپ کو اپنی زندگی میں ملے وہ سب فرشتہ تھے؟ ایسا نہیں ہے۔

اہم ترین چیزوں کی نسبت ہم بچوں کو غیر ضروری چیزیں سکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چیزیں جو واقعی اہم نہیں ہوتیں، ہم انہیں سکھاتے ہیں، اور جو ضروری ہوتی ہیں، ان پر توجہ نہیں دیتے۔ ہم بچوں کا دماغ اپنے طریقے سے بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کل میں ایک فنکشن پر گیا تھا، جہاں بچوں کی ایک پوری ٹولی اکٹھی تھی۔ میں نے

ایک ایک کر کے کچھ بچوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے ان کا نام پوچھا۔ ان سے پوچھا کہ بتاؤ، آپ کو ماما زیادہ اچھی لگتی ہیں یا بابا؟ سب بچوں نے ایک ہی جواب دیا کہ "دونوں"۔ میں نے کہا، "نہیں، ایک نام بتاؤ۔" وہ آڑے رہے کہ "نہیں، دونوں۔" میں نے سوال کیا کہ آپ کو کون زیادہ مارتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ "کوئی نہیں مارتا" اور وہ آڑے رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بچے انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں جو ان کے ساتھ کھیلتے ہیں، انہیں کھانے پینے کی چیزیں لا کر دیتے ہیں اور انہیں مارتے نہیں ہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کو ان کے والدین سے مار نہیں پڑتی تھی، سب میرے کزنوں کے ہی بچے تھے، مجھے معلوم تھا کہ مار تو پڑتی ہے، مگر انہیں ذہنی طور پر اس طرح تیار کر دیا گیا تھا ڈرا کر، مار کر، اور مارنے کے بعد ناراضگی دیکھا کر کہ وہ ہر حال میں دونوں کو اچھا کہیں۔

اس سے بچے اصل میں دوسروں کو کاپی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید انہیں ویسا ہی بننا چاہیے جیسا دوسرے چاہتے ہیں۔ یہاں سے ان کا اپنا پن ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔

ہم بچپن سے بچوں کو ان کی مرضی کرنے ہی نہیں دیتے، جس کی وجہ سے وہ ہر وقت یہ سوچتے ہیں کہ شاید انہیں ہر کام دوسروں سے پوچھ کر کرنا چاہیے۔ اس سے ان کی فیصلہ کرنے کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ ہم بچوں کو وہ بنانا چاہتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں ایک بچہ وہ ہوتا ہے جو وہ خود سوچ سمجھ کر بنے۔ اگر آپ خود کو بھی دیکھ لیں تو آپ کو اپنی ذات میں بھی یہی کچھ نظر آئے گا۔ ابھی چاہے آپ جتنا مرضی انکار کر لیں، مگر دنیا کی گہرائی میں آپ سچ جانتے ہیں۔

میں نے ایک اور چیز بھی محسوس کی ہے کہ بہت سے لوگوں کو شکایت ہے کہ انہیں سمجھ ہی نہیں آتی کہ ان کا مقصد کیا ہے، انہیں کیا کرنا چاہیے، ان کی اپنی شخصیت کا علم انہیں بالکل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں کیا پسند ہے، کیا کرنا انہیں اچھا لگتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ایک سفید کاغذ پر اپنی دلچسپیاں لکھیں جو آپ اپنے فارغ وقت میں کرنا

پسند کرتے ہیں۔ تقریباً 70 فیصد لوگ اس مسئلے کا شکار ہیں۔ کچھ لوگ اس چیز سے انکار کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ "جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہونا ہے"۔ بالکل وہی ہونا ہے، مگر آپ اس وقت ایک ایسے انسان بن چکے ہیں جس کا کوئی واضح مقصد نہیں ہے۔ زندگی کے اس خلا کو "وجودی خلا" کہا جا سکتا ہے۔

اس خلا میں جب انسان دوسروں کی باتیں، طعنے اور رویے سنتا ہے تو اس کا رجحان دو طرف ہو جاتا ہے: ایک، یا تو وہ ہر طرح سے پیسے کمانے کے لالچ میں پڑ جاتا ہے، جس سے حسد، کینہ، فساد، اور چوری جیسی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ دوسری طرف وہ جذباتی تعلقات اور مشت زنی اور سیکس میں دلچسپی میں الجھ جاتا ہے، جو بالآخر عشق کے دھوکے میں بدل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ریلیشن شپ جیسے معاملات جنم لیتے ہیں، پھر اگر شادی ہو جائے تو طلاق، لڑائی جھگڑا اور اگر نہ ہو تو بے وفائی کا دکھ۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے، اور پھر نشے کی طرف مائل ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیتا ہے۔

اسی لیے کبھی بھی اپنے اندر کے سوالات کو مت دبائیں، ان پر تحقیق کریں اور اپنی زندگی کا مقصد جاننے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ آپ اصل میں کون ہیں؟

"انسان درحقیقت بہت اکیلا ہے، بالکل اکیلا"

یہ میرے ساتھ بہت عام ہوتا ہے کہ جب میرا دل کرتا ہے کسی سے بات کروں، تو میں اپنی کانٹیکٹ لسٹ کھولتا ہوں، لیکن مجھے کوئی ایسا بندہ نہیں ملتا جسے میں یہ سمجھوں کہ یہ صحیح ہے۔ دو چار لوگ جو مجھے مناسب لگتے ہیں، ان سے بات

کرنے کا دل نہیں کرتا، اور میں یہ سوچ کر انہیں کال بھی نہیں کرتا کہ کہیں وہ مصروف نہ ہوں، کیونکہ ان کی اپنی بھی زندگی ہے۔ جب بھی ہم کال کرتے ہیں، خواہ وہ کریں یا میں، تو وہ بہت لمبی چلتی ہے، اور یہ ایک عام بات ہے۔

یہ صرف میرے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ بہت سے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تب میں کاغذ اور قلم لے کر لکھنا شروع کر دیتا ہوں کیونکہ کاغذ میں انسانوں سے زیادہ صبر ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر کوئی مجھے اپنے دکھ سناتا رہتا ہے، لیکن آج جب کسی نے مجھے اپنا دکھ نہیں سنایا، تو مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔ آج میں نے ایک چیز بہت شدت سے محسوس کی کہ انسان در حقیقت بہت اکیلا ہے، بالکل اکیلا۔

کل میرے انکل مجھے ایک پرانا واقعہ سنا رہے تھے کہ کوٹ عبد المالک میں ایک 14-15 سال کی لڑکی تھی، جس کا نام پیلی تھا۔ وہ پورے علاقے میں بدکردار سمجھی جاتی تھی۔ پھر اس کے ماموں اور چچا نے مل کر اسے قتل کر کے خانپور نہر میں پھینک دیا۔ جلد ہی حقیقت سامنے آ گئی اور ان دونوں کو عمر قید ہو گئی۔

سات سال بعد جب نہر خشک ہوئی، تو اس لڑکی کی لاش صحیح سلامت بر آمد ہوئی۔ حالانکہ ڈیڈ باڈی عام طور پر گل سڑ جاتی ہے، لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ بالکل ویسی ہی نکلی جیسے تھی۔ واللہ اعلم کہ اس کے پیچھے کیا سائنسی وجہ تھی، مگر لوگوں نے اسے ایک خاص رنگ دے دیا۔

اس واقعہ سے میں نے سیکھا کہ ہمیں کبھی کسی کی کردار کشی نہیں کرنی چاہیے، خاص طور پر لڑکیوں کی۔ میں خود بھی ہمیشہ دوسروں پر جلدی رائے قائم نہیں کرتا، لیکن بعض اوقات انسان غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کئی بار جو ہمیں برا لگتا ہے، وہ واقعی برا ہوتا ہے، اور کئی بار ایسا نہیں ہوتا۔

ہر انسان کے اپنے اپنے دکھ ہوتے ہیں، اور ہر کسی کو اپنا دکھ سب سے بڑا لگتا ہے۔ مگر والدین کا سب سے بڑا دکھ وہ ہوتا ہے جو والدین اپنی اولاد کے لیے محسوس کرتے ہیں۔ میں خود والد تو نہیں ہوں، لیکن جتنا میں نے محسوس کیا، والدین کا سب سے بڑا خوف یہی ہوتا ہے کہ ان کی اولاد کو کچھ ہو نہ جائے۔

کچھ والدین سخت مزاج ہوتے ہیں، مگر عمومی طور پر والدین ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کی بھلائی کے لیے سختی کرتے ہیں۔ البتہ، میں نے کچھ ایسے والدین بھی دیکھے ہیں جو اپنی اولاد سے کہتے ہیں: "اگر تم نہ ہوتے تو بہتر ہوتا" یا "تمہارے ہونے سے بہتر تھا کہ تم پیدا ہی نہ ہوتے۔" بعض اوقات وہ اپنی ہی اولاد پر لعنت بھیج دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ بھی کہہ دیتے ہیں: "تم مر جاؤ، ہمیں تمہارے مرنے کا کوئی دکھ نہیں ہو گا۔"

کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے اپنے والدین نے انہیں یہی الفاظ کہے، اور جب وہ یہ بتا رہے تھے تو وہ رو پڑے۔ مگر میں نے ایک چیز نوٹ کی کہ ایسا زیادہ تر تب ہوتا ہے جب والدین جذباتی ہو جاتے ہیں ان کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو سمجھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں اسی طرح، اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے والدین کی سوچ اور احساسات کو سمجھیں۔

اس کے ساتھ ساتھ، ہر انسان کو دوسروں کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے، بغیر اپنی ترجیحات کو درمیان میں لائے۔ (مگر میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اپنی ترجیحات کو چھوڑ دو یا ختم کر دو مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اپنی ترجیحات کو سب سے پہلے جگہ دینی چاہیے کیونکہ ہماری ترجیحات ہمارے رحم و کرم پر ہوتی ہیں انہیں کسی باہر کے بندے نے آ کر پورا نہیں کرنا) کیونکہ جب ہم کسی کو سمجھنے کے لیے اپنی ترجیحات رکھنا شروع کر دیتے ہیں تو ہمیں اگلا انسان غلط اور خود کی ذات صحیح لگنے لگتی ہے۔

2025/02/10

" جسے جس چیز کی کمی سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے، اس کے لیے وہی سب سے بڑا غم ہے "

مجھ سے میرے ایک دوست نے سوال کیا کہ، "معیز! زندگی کا سب سے بڑا دکھ کیا ہے؟"

مجھے لگتا ہے کہ ہر شخص جو اس دنیا میں آتا ہے، اپنی قسمت لے کر آتا ہے۔ ہر شخص کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، اس لیے ہر شخص کا سب سے بڑا دکھ بھی الگ ہوتا ہے۔ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہے جنہیں ان چیزوں کا دکھ تھا جو ان کے پاس نہیں تھیں۔ کچھ لوگوں کو لگتا ہے کہ پیسے کی کمی ہی سب سے بڑا دکھ ہے، کیونکہ اسی کے ذریعے ہم اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اگر زندگی ہو اور زندگی کی ضروریات پوری نہ ہوں، تو اس کا کیا فائدہ؟

اس کے برعکس، میں نے کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن کے پاس دولت تو بہت تھی، مگر ان کے پاس اولاد نہیں تھی، اور ان کے لیے اولاد نہ ہونے کا غم سب سے بڑا تھا۔

ایک دن میں اسی موضوع پر سوچ رہا تھا کہ کس کا غم سب سے بڑا ہے؟ پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جسے جس چیز کی کمی سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے، اس کے لیے وہی سب سے بڑا غم ہے۔

میں ایک مرتبہ اسپتال کے وارڈ میں تھا، وہاں ایک بزرگ شخص تھے جنہیں دل کے مسائل تھے اور ان کا بائی پاس ہونا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا، " آپ نے اپنی زندگی کیسی گزاری؟ اور آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کی زندگی سے مجھے کیا سیکھنے کو مل سکتا ہے؟"

انہوں نے مجھے کہا:

" ایک دن تو ہم سب نے ویسے ہی الگ ہو جانا ہے، کوئی رشتہ نہیں بچے گا۔ ماں باپ، اولاد، بہن بھائی—سب سے ایک دن بچھڑ جانا ہے۔ مگر اگر یہ جدائی صرف موت کی وجہ سے ہو تو بہتر ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہیں دیکھ

کر لگتا تھا کہ شاید انہیں کوئی دکھ ہے ہی نہیں، کیونکہ میں نے انہیں کبھی روتے یا کسی سے گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ مگر جلد ہی میرا یہ گمان بھی غلط ثابت ہو گیا۔ ان کے دکھ شاید ہم سب کے دکھوں سے زیادہ اذیت ناک تھے۔"

"ایک انسان کو جب تکلیف ہوتی ہے تو وہ غصہ کرتا ہے، جب یہ تکلیف بڑھ جائے اور وہ بے بس ہو جائے تو رونے لگتا ہے، پھر جب یہی تکلیف یادوں اور بے بسی میں ڈھل جائے تو وہ چپ ہو جاتا ہے، اور جب وہ روز اسی تکلیف سے گزرتا ہے، تو ہنسنے لگتا ہے۔ پھر وہ ایسا بن جاتا ہے کہ اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ اس کے لیے یہ سب دکھ اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔"

"لیکن یہ ساری کیفیات انتہا درجے کی ہیں۔ یہ تب بھی ہو سکتی ہیں جب انسان اس کیفیت سے گزر رہا ہو اور اسے خود نہ پتا چلے کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔ تب بھی اسے لگتا ہے کہ اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، اور وہ اسی عمل سے گزرتا ہے—پہلے غصہ کرتا ہے، پھر روتا ہے، پھر چپ ہو جاتا ہے، اور پھر ہنسنے لگتا ہے۔ مگر یہ انتہا نہیں ہوتی۔"

" ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی دکھ ہمیشہ نہیں رہتا۔ جیسے بچپن میں جب ہمیں لگتا تھا کہ ماما یا بابا شاید ہم سے زیادہ کسی اور سے پیار کرتے ہیں، تو ہمیں دکھ ہوتا تھا۔ جب ہمیں وہ کھلونا نہیں ملتا تھا جو ہمیں بہت پسند تھا، تو ہم رونے لگ جاتے تھے۔ مگر اب جب ہمارے پاس وہ سب کچھ خریدنے کی طاقت ہے، تو ہم خریدتے ہی نہیں، کیونکہ ہمیں ان کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

"عمر کے ساتھ ساتھ ہماری ضروریات بدلتی جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے غم کے وقت کو خاموشی سے دیکھنا چاہیے کہ اسے ختم کیسے کرنا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ مسئلوں کا کوئی حل ہی نہیں ہوتا، لہٰذا جن کا کوئی حل نہ ہو، انہیں چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خود ہی الجھ کر ختم ہو جاتے ہیں۔"

2025/02/11

"ہم جیسا سوچتے ہیں، ویسا ہی محسوس کرتے ہیں"

آج مجھ سے میرا ایک دوست سوال کر رہا تھا کہ اگر آپ کو آپ کا کوئی بہت ہی قریبی شخص مطلبی کہے تو آپ کیا کریں گے؟ اچھا، مجھے لگتا ہے کہ اس طرح کے معاملے میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ بات کرنے والا اصل میں کون ہے—مرد ہے یا عورت؟ اگر تو وہ کوئی عورت ہے، تو پھر اسے نظر انداز ہی کرنا چاہیے۔ اچھا، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ عورت کوئی بری ہوتی ہے، مگر اصل میں عورت بہت جذباتی ہوتی ہے۔ اسے چھوٹی چھوٹی چیزیں بہت بڑی اور بھاری محسوس ہوتی ہیں، اور اسے لگتا ہے کہ یہ بندہ میری ذرا سی بھی پروا نہیں کرتا۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ لڑکی کے احساسات ٹھیک ہوں اور واقعی آپ ہی غلط ہوں۔

اس کے برعکس، اگر یہ بات کرنے والا کوئی لڑکا ہو تو میں سب سے پہلے یہ دیکھوں گا کہ اصل بات کیا تھی، پھر اس بات کا صحیح طریقے سے جائزہ لوں گا۔ اگر میں اس نتیجے پر پہنچوں کہ نہیں، میں ٹھیک ہوں، تو میں اسے یہ کہوں گا کہ جناب، میں ایسا ہی ہوں کیونکہ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں۔ اور اگر مجھے لگے کہ نہیں، میری غلطی ہے، تو میں اس پر معذرت کر لوں گا۔

اسی طرح، وہ مجھ سے ایک اور بات بھی کرتا ہے کہ اس نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ جب بھی وہ خوش ہوتا ہے، تو کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے اور ساری خوشی کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اچھا، یہ بات اور طریقوں سے بھی مجھ سے بہت سے لوگوں نے کی ہے، جیسے ایک دفعہ میری بہن میرے سامنے بہت زیادہ ہنسی، پھر کہنے لگی کہ "نہیں، زیادہ مت ہنسو، ورنہ رونا پڑے گا۔" میں ایسی چیزوں پر یقین نہیں رکھتا، اور میرا تو یہ ماننا ہے کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ آپ کو لگتا ہے کہ ایسا

ہی ہو گا۔ اصل میں جس چیز کو ہم عجیب نظر سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، وہ ہمیں ویسے ہی لگنے لگتی ہے۔ یہ محض ایک اتفاق ہوتا ہے، مگر ہم ایک آدھ دفعہ ہونے کے بعد اس پر قائم ہو جاتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے، جبکہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔

مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں چھوٹا تھا، تو ہمارے محلے کے دوستوں میں ایک بات بڑی مشہور تھی کہ "ریگ ماہی" (جسے ہم لوگ سانپ کی ماسی کہتے تھے) کو مارنے یا ہاتھ میں پکڑنے سے پیسے ملتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں اسکول سے باہر نکلا، تو کچھ لڑکے ایک ریگ ماہی کو مار رہے تھے۔ میں نے بھی ایک پتھر مارا، تو وہ میرے پتھر سے مر گئی۔ خیر، میرے دوست مجھے ڈرانے لگے کہ اب سانپ تم سے بدلہ لینے آئے گا۔ تب میں چھوٹا تھا، مگر تب بھی میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

میں اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر واپس آ رہا تھا۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے وہ اپنے گھر کی طرف مڑتا تھا اور میں اپنے گھر کی طرف، تو اس جگہ مجھے دس روپے مل گئے۔ میں خوش تو بہت ہوا، اور ایک لمحے کے لیے مجھے لگا بھی کہ شاید سانپ کی ماسی کو مارنے کی وجہ سے مجھے یہ پیسے ملے ہیں، مگر میرا یقین دوسری بات پر زیادہ پکا تھا، اس لیے میں پہلی بات پر نہیں گیا۔ اس کے بعد میں نے کئی ریگ ماہی مارے، مگر کبھی کوئی پیسے نہیں ملے۔

یہ سب کچھ محض اتفاق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ سب توہم پرستی ہے، اس لیے اگر ایسا ہو بھی جائے، تو اس پر یقین نہیں رکھنا چاہیے۔

"جس کے پاس سب کچھ ہو، وہ ناشکرا بن جاتا ہے"

آج جب میں اپنے ادارے کے لیے گھر سے نکلا تو میں بہت جلدی میں تھا کیونکہ مجھے راستے میں ایک ضروری کام بھی نپٹانا تھا۔ میں جلدی سے بس میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بس اپنے ایک اسٹاپ پر رکی تو کچھ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ عمر میں مجھ سے تھوڑے بڑے تھے مگر 22 سے زیادہ نہیں ہوں گے، جسامت میں بھی صحت مند تھے۔ تھوڑی دیر بعد میری ان پر نظر پڑی کہ وہ اپنا ہاتھ ہلا رہے ہیں، وہ اشاروں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بس میں بہت سے لوگ ان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی باتوں میں مکمل طور پر مگن تھے اور انہیں کوئی پتا نہیں چل رہا تھا کہ لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں۔

مجھے ان کی بات سمجھ تو نہیں آئی کہ وہ کیا باتیں کر رہے تھے، مگر ایک چیز میرے دماغ میں آئی کہ ہم لوگ کتنے خوش قسمت ہیں جو اپنی زبان سے اپنے احساسات دوسرے بندے کو پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے پاس زبان نہیں تھی، مگر وہ پھر بھی ایک دوسرے کو سمجھ کر ہنس رہے تھے۔ اس سے مجھے ایک بات سمجھ آئی کہ واقعی جس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، وہ ناشکرا بن جاتا ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا جو میں نے ایک دفعہ پڑھا تھا۔

ایک عورت کو اپنے بچے کے مرنے کا بڑا غم تھا اور اس کا دوسرا بچہ بھی معذور تھا۔ وہ غم اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا۔ اس نے اس غم میں خودکشی کی کوشش کی مگر قسمت سے بچ گئی۔ زخمی حالت میں اسپتال لائی گئی، کچھ عرصہ اس کا علاج چلا اور وہ صحت مند تو ہو گئی، مگر اسے یہ غم ابھی بھی تھا اور مستقبل میں وہ اس غم کی وجہ سے پھر ایسا کر سکتی تھی، اس کا خطرہ بھی تھا۔

اسپتال کے ڈاکٹرز اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے اور اس عورت سے پوچھا، "آپ کی عمر کیا ہے؟" اس نے اپنی عمر تیس سال بتائی۔ تو ایک ڈاکٹر نے کہا، "نہیں، تمہاری عمر اسی سال ہے۔ اب بتاؤ، اگر تم ایک امیر ترین شخص سے شادی شدہ ہوتی اور مزے سے اپنی زندگی گزار رہی ہوتی، تو اب موت کے وقت تمہیں کیسا لگتا؟"

اس نے تھوڑی دیر سوچا، پھر بولی، "شاید اچھا نہیں لگتا، کیونکہ مجھے میری زندگی کا کوئی فائدہ تو نظر نہیں آیا۔"

ڈاکٹر نے کہا، "اب تم اپنے بیٹے پر واپس آؤ، جو معذور ہے اور تم لگاتار کوشش کرتی ہو اس کی زندگی بہتر بنانے کے لیے۔ تو اب تمہیں تمہاری زندگی کیسی لگتی ہے؟"

وہ پھر خاموش ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد بولی، "ایک بامعنی زندگی۔"

ڈاکٹرز نے یہ جواب سن کر خاموشی سے سب کچھ بند کر دیا اور وہاں سے اٹھ گئے اور اسے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر وہ بہت زیادہ روئی، پھر ایک دم چپ ہو گئی۔ اتنی دیر میں ڈاکٹرز نے اس کے بیٹے کی ویل چیئر اس کے کمرے میں لے آئے۔ یہاں سے اس کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ شروع ہوا۔

دنیا بہت بڑی ہے، اس دنیا میں انسان بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک طرف ایک شخص خوش ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک آدمی بہت تکلیف میں ہوتا ہے۔ ایک جگہ ایک جان دنیا میں آ رہی ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک جان دنیا سے جا رہی ہوتی ہے۔ ہمارے اردگرد کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے ہم بالکل بے خبر بیٹھے ہوتے ہیں۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میرے ایک اسٹوڈنٹ نے اسٹیٹس پر لگایا تھا: "شکر الحمدللہ، میرے بھائی کو انصاف ملا، اس کے قاتل کو سزائے موت سنا دی گئی ہے۔" جس پر میں نے اسے میسج کیا، "قتل؟ کیا مطلب؟" اس نے مجھے بتایا کہ اس کے کزن کا قتل کیا گیا تھا اور عدالت نے قاتل کو سزائے موت سنا دی ہے۔

میں نے اس سے سارا واقعہ پوچھا تو اس نے بتایا، " آج سے تین سال پہلے میرا کزن اور اس کا دوست ایک شادی پر گئے تھے۔ وہاں پر ان دونوں میں کچھ اختلاف ہو گیا اور وہیں ان میں گالی گلوچ شروع ہو گئی۔ بات ہاتھاپائی تک پہنچ گئی اور دوست نے غصے میں آکر اس کا قتل ہی کر دیا۔ تین سال عدالت میں کیس چلا، جس کے بعد اسے سزائے موت سنادی گئی۔"

میں نے پوچھا، "اس کو پھانسی کب ہونی ہے؟"

اس نے بتایا، "کل کا کہا ہوا ہے۔"

اس دن میں نے اپنی فیملی کے ساتھ ایک دعوت میں جانا تھا۔ ہم سب وہاں بیٹھے ہوئے تھے، سب بہت زیادہ مذاق کر رہے تھے اور بے پناہ ہنس رہے تھے، اور میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ ہم یہاں کتنے خوش ہیں اور وہ اس وقت کیا کیفیت میں ہو گا؟ جو یہ سوچ رہا ہو گا کہ صبح میں نے مر جانا ہے! جب وہ خود دیکھے گا کہ پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈالا جائے گا؟

میں نے دعوت سے واپسی کے وقت اپنے گھر والوں کو بتایا تو میری ماما کہنے لگیں، "وہ تو ایک طرح سے آدھا مر گیا ہو گا کہ جب وہ سوچ رہا ہو گا کہ اب میری موت پکی ہے۔"

اسی طرح، آج جب میں نے یہ بس والا واقعہ دیکھا، ویسے ہی آج میں نے ایک اور واقعہ دیکھا۔ میں عام طور پر واپس اپنے بابا کے ساتھ آتا ہوں۔ واپسی پر ہم دونوں ایک ریڑھی کے پاس کچھ پھل لینے کے لیے رُک گئے۔ اس ریڑھی کے الٹی طرف، تھوڑی پیچھے، مالٹوں کی ایک اور ریڑھی لگی تھی، جس پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس ریڑھی کے پیچھے فٹ پاتھ پر دو آدمی اور بھی کھڑے تھے۔ کچھ جھگیوں کی لڑکیاں مالٹے والی ریڑھی سے پھل دیکھنے لگیں تو پیچھے والے دو آدمیوں میں

سے ایک آدمی، جس کی عمر زیادہ تھی، جس کے بال اور تھوڑی تھوڑی داڑھی سفید تھی، نے اپنے ہاتھ سے ان لڑکیوں کو ایسے ڈرا کر بھگایا جیسے وہ انسان نہیں، جانور ہوں!

پھر وہ آدمی ریڑھی والے اور ساتھ والے سے کچھ طنزیہ انداز میں باتیں کرنے لگا اور طنزیہ ہنسا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بہت غصہ آیا۔ پہلے تو میں اتر کر اسے پکڑنے لگا تھا، مگر بابا کی موجودگی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا کیونکہ بابا کا اس طرف دھیان ہی نہیں پڑا۔ بہر حال، ایک چیز جو میں نے آج نوٹ کی، وہ یہ تھی کہ ہم میں سے وہ لوگ جن کے پاس ضرورت کی ساری چیزیں موجود ہیں، وہ ناشکرے بن گئے ہیں اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے ہیں۔

2025/02/12

"ہم آج تعلیم کے نام پر دھوکہ ہی حاصل کر رہے ہیں"

آج میرے دن کی ابتدا بڑی عجیب سی ہوئی۔ آج کل میں رات کو کافی دیر سے سو رہا ہوں، اور ظاہری بات ہے کہ دیر سے سونے کی وجہ سے آج کل تھوڑا دیر سے ہی اٹھ رہا ہوں۔ آج صبح میں تقریباً 10 بجے کے قریب اٹھا تو طبیعت تھوڑی سی خراب سی لگ رہی تھی۔ خیر، وہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا ان دنوں میں جرمن زبان پڑھ رہا ہوں، تو اس کا کچھ کام رات کو مکمل کرنے والا رہ گیا تھا۔ وہ مکمل کرنے کے لیے بیٹھ گیا مگر وہ مکمل پھر بھی نہیں ہوا کیونکہ میرے نکلنے کا وقت ہو گیا تھا، اور کیونکہ مجھے تقریباً دو گھنٹے سفر کر کے جانا تھا۔

خیر، میں گھر سے نکلا اور ابھی میں اپنے لینگویج سینٹر کے باہر پہنچا ہی تھا کہ میرا دوست اچانک باہر بڑا جلدی میں آیا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں پیچھے سے اس کے پاس گیا، اور جب اس نے مجھے دیکھا تو ہم گلے ملے۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے گھر جانا

ہے، بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ چلو، میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ ہم دونوں نکلے اور اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں جا کر کچھ ٹیسٹ کروائے تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں نکلا۔

اس کے بعد ہم واپس لینگویج سینٹر تو نہیں گئے، اس کے گھر چلے گئے، جہاں ہم دونوں بیٹھ کر پڑھنے لگ گئے۔ کوئی گھنٹہ پڑھنے کے بعد میں وہاں سے نکلا کیونکہ میں عام طور پر بابا کے ساتھ ہی واپس آتا ہوں، کیونکہ ان کا آفس میرے لینگویج سینٹر کے پاس ہی ہے۔ اس لیے، اس کے گھر سے میں نے بائیک کروائی بابا کے آفس تک۔ جیسے ہی بائیک والا چلا، تو وہ کہنے لگا کہ آپ رائیڈ کینسل کر دیں۔ میں نے پوچھا، "کیوں؟" تو وہ کہتا کہ "مجھے فائدہ ہو جائے گا، کمیشن بچ جائے گا۔" یہ بات مجھے بڑی عجیب لگی تو میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ "آپ کو راستہ پتا ہے؟" میں نے اسے کہا کہ "آپ نیویگیشن لگا لیں۔" مجھے تھوڑا تھوڑا عجیب سا لگنے لگا کیونکہ ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں جہاں پر ایسے ہی لوگ لوٹ لیتے ہیں۔ خیر، کیونکہ ہم نے جس راستے سے جانا تھا، وہ لوگوں سے بھرا ہوتا ہے، اس لیے تھوڑی تسلی بھی تھی۔

جب ہم واپس جا رہے تھے تو میں نے ایک تین روڈ والے چوک پر ایک لڑکی کو کھڑے دیکھا، جہاں پر لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ لڑکی ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی۔ اس نے برقع تو پہنا تھا، مگر اپنے چہرے سے نقاب اتارا ہوا تھا۔ اس لڑکی کی چہرے کی رنگت بہت سفید تھی، بہت ہی حسین لڑکی تھی۔ عمر میں بھی کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی، کوئی 17 یا 18 سال کی ہو گی، اور اس نے بیگ پہنا ہوا تھا اور ایک چشمہ لگایا ہوا تھا۔

اس کا چشمہ دیکھ کر ایسا احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ واقعی کسی مجبوری میں ہو۔ میں ایسا بھی نہیں کہ مجبوری صرف کسی پھٹے پرانے لباس والے کو ہی ہو، سونے کا تاج پہننے والا بھی مجبور ہو سکتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ کہی

سے پڑھ کر آرہی ہے۔ ایک طرف مجھے بائیک والے پر شک تھا، اور دوسری طرف میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا ہی مجبوری ہو سکتی ہے کہ ایک لڑکی اتنی مجبور ہو گئی کہ روڈ پر ہی نکل آئی؟ کیونکہ ایسا بھی نہیں کہ عزت والا کام نہ ملے۔
ایک لڑکی گھر میں بچوں کو پڑھا کر عزت سے اپنا کام کر سکتی ہے، مگر آج کل معاشرے کا یہ المیہ بھی بن چکا ہے کہ جو شخص کچھ نہیں کرنا چاہتا، وہ بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف کام کر کے تھوڑے پیسے ملتے ہیں اور دوسری طرف کوئی کام نہ کر کے واسطے دے کر اچھا خاصا پیسہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔
مجھے وہ بات بڑی یاد آتی ہے ایسے موقعوں پر کہ اگر ایک عادی بھیکاری کو ایک لاکھ روپے بھی دو گے تو وہ اگلے دن اسے چھپا کر پھر سے بھیک مانگنے لگ جائے گا۔ میں نے لاہور میں ایسے اور بھی کئی واقعات دیکھے ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنے بابا کے ساتھ ہی کہیں جا رہا تھا تو میری نظر ایک لڑکے پر پڑی، جو ہاتھ میں ایک پوسٹر لے کر کھڑا تھا، جس پر مدد کے لیے لکھا ہوا تھا۔

اس نے بھی یونیفارم پہنا ہوا تھا، اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ اس کو کوئی ضرورت ہے۔ اور اگر تھی بھی، تو وہ تو مجھ سے عمر میں بڑا ہی لگ رہا تھا۔ وہ کام کر کے پیسے آرام سے کما سکتا تھا، مگر وہ بھی روڈ پر کھڑا تھا۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے کبھی کبھی یہ لگنے لگتا ہے کہ شاید لاہور کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی والے طلبہ نہیں، بلکہ بھیک مانگنے کی ٹریننگ دینے لگ گئے ہیں۔ کیونکہ میں نے ایسے کئی لوگ دیکھے ہیں جو بلاواسطہ انہیں جگہوں سے نکل کر ایسا کام کر رہے ہیں۔
مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کیوں؟
ایک جگہ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان جگہوں سے پڑھنے کے بعد اکثریت میں یہ غرور آجاتا ہے کہ وہ کوئی کم درجے کا کام نہیں کریں گے۔ مگر میرا سوال یہ ہے کہ کام کو درجہ کس نے دیا ہے؟ ہم نے خود!

اس کی جگہ جو سب سے گھٹیا کام ہے —مانگنا، وہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مجھے یہ سب سمجھ نہیں آتی کہ یہ کب سے کوئی عزت دار کام بن گیا ہے؟

جو لوگ ان اداروں سے نکل کر ایسا کر رہے ہوتے ہیں، ان میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو عشق کے مارے ہوتے ہیں۔ جب یہ ان اداروں میں عاشقی کرتے ہیں، تو اچھا خاصا وقت گزار لیتے ہیں۔ پھر جب ان کا یہ ارادہ شادی وغیرہ کے پلان تک پہنچتا ہے، تو پہلے نمبر پر تو لڑکی دو چپیڑیں کھا کر آرام سے بیٹھ جاتی ہے اور لڑکا اس کے غم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

پھر وہ ڈپریشن میں چلا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے اس ڈپریشن کو کم کرنے کے لیے سگریٹ کا استعمال شروع کرتا ہے۔ پھر یہی سگریٹ بڑھتے بڑھتے نشے کی لت تک پہنچ جاتی ہے۔

پھر جب یہ باتیں گھروں تک پہنچتی ہیں، تو وہ سب تعلق توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنی اس لت کو پورا کرنے کے لیے یا تو چوری کرنا شروع کر دیتا ہے یا بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے۔

اس ساری گیم کے اندر لڑکے بھی کہیں پیچھے نہیں ہوتے، وہ بھی اس معاملے میں لڑکی کا بہت بڑا نقصان کر دیتے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی پہلے تو باتیں کرنا شروع کرتے ہیں، شروع سب بہن بھائی کے نام سے ہی ہوتا ہے، باقی پروسس بعد کے ہیں۔ پھر یہی باتیں پیار محبت تک چلی جاتی ہیں، پھر یہی محبت راتوں کی لذت تک پہنچ جاتی ہے۔ لڑکا لڑکی سے کہتا ہے کہ "یقین ہے؟" جب وہ کہے "ہاں"، تو کہتا ہے "سب اتارو"۔ پھر عزت پامال ہو جاتی ہے، اور لڑکی اپنی اس بے وقوفی پر اپنے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کے چہرے پر بھی کالک مل دیتی ہے۔

ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ اس کے بعد بھی اس نے آپ کو نہیں اپنانا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو لڑکی اس کی محبت میں یہ کر رہی ہے، وہ جلد یہی کام کسی اور کے ساتھ بھی کرے گی۔ وہ بس اپنا مزا پورا کرتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔

مجھے ایک دفعہ میرے انکل نے ایک واقعہ بتایا کہ ان کی ٹریننگ سینٹر میں ایک لڑکا اور لڑکی پڑھتے تھے۔ ان دونوں کی آپس میں سیٹنگ تھی۔ انہوں نے بھاگنے کا پلان بنایا۔ انہوں نے ایک مقرر جگہ طے کی کہ وہاں سے مل کر بھاگ جائیں گے۔ لڑکی وہاں پہنچ گئی، مگر لڑکا نہیں آیا۔

لڑکی نے لڑکے کو کال کی، مگر اس نے نہیں اٹھائی۔ اس لڑکی کے پاس کہیں اس کے دوست کا نمبر تھا، اس نے اسے کال کی تو اس نے اٹھالیا۔ اس نے اسے ساری بات بتائی۔ اس لڑکے کے دل میں لالچ اٹھا۔ اس نے اسے کہا کہ "مجھے سب پتا ہے، اس نے مجھے کہا تھا کہ یوں تم آؤ گی، تو میں تمہیں یہاں بلالوں اور اس کے پاس چھوڑ آؤں۔"

وہ لڑکی اس کے پاس چلی گئی، اور وہ اسے ملتان لے گیا، جہاں جاکر اس نے اس کے ساتھ پہلے ربر ستی کی اور پھر اسے کوٹھوں والیوں کو بیچ دیا۔ اور اس سے کوٹھوں والیوں والا کام شروع کروالیا گیا۔ ٹریننگ سینٹر میں جو لوگ پڑھنے آتے ہیں، وہ عام طور پر مالی طور پر کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں، اس لیے کوئی کچھ نہیں کر پایا۔ پولیس نے لڑکی کی مرضی کے نام پر کیس کا چیپٹر ہی کلوز کر دیا۔

ان ساری باتوں سے میں نے ایک بات سیکھی ہے کہ لڑکوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ جس لڑکی کو اس کے والدین نے پیدا کیا، اسے پالا، بڑھا کیا، اس کی ہر ضرورت کی چیز پوری کی، محبت دی، اپنی نسبت دی، مگر اسے منع کیا کہ کسی سے ناجائز رابطے میں نہ رہے، وہ ان کی سگی نہ بن کر تمہارے ساتھ رابطے میں ہے، تو شادی کے بعد تمہاری تین چار سال کی محبت اسے کسی اور کے ساتھ رابطہ رکھنے سے نہیں روک سکتی۔

آج ہمارے معاشرے میں بھیکاریوں کی بڑی تعداد یہی سے آئی ہوئی ہے۔ یہ ہمارے ادارے اس وقت اپنی جیبوں کے پوجاری ہیں۔ ہم آج تعلیم کے نام پر دھوکہ ہی حاصل کر رہے ہیں۔

(مذہبی ادارے، مدرسوں کے بارے میں، مجھے کسی زمانے میں لگتا تھا کہ یہی صحیح ہیں کہ جہاں ایک بندہ حقیقی علم حاصل کر سکتا ہے، مگر میرا یہ گمان بھی غلط ہو گیا۔ مدرسے ان تعلیمی اداروں سے زیادہ بھیانک بن گئے ہیں۔ آئے دن واقعات آ رہے ہیں کہ فلاں مدرسے کے استاد نے فلاں بچے کے ساتھ زیادتی کر کے قتل کر دیا۔

ایک مدرسے کا پرنسپل مفتی، میرا دوست تھا۔ اس نے مجھے بتایا: "معیز بھائی! آپ لوگ یہ بائیولوجی پڑھتے ہیں، آپ کو لگتا ہے کہ یہ بہت ننگی کتابیں ہیں؟ مدرسے کے بچوں اور استادوں میں یہ بائیولوجی پڑھنے والوں سے زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ ہم لوگ رات کو تین دافعہ اٹھ کر سب کے کمروں میں دیکھنے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔")

مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ سب یہی لوگ ہوتے ہیں۔ کئی واقعی اصل مجبور ہوتے ہیں، میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں کہ وہ مجبوری کے باوجود کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

اور ہاں! میں ان لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں جنہوں نے فاؤنڈیشن کے نام پر ڈھونگ رچایا ہوا ہے؟ یہ بھی ہمارے معاشرے کا بھیانک چہرہ ہے، جس کو مختلف رنگ دیے گئے ہیں۔ ویسے تو اسے ایسے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ بہت اچھے ادارے ہیں، مگر شاید ہی اچھے ہوں۔ ان میں ہونے والے کام سب سے بدتر کاموں میں سے ایک ہیں۔

اس میں غریبوں کے نام پر پیسہ اکٹھا کیا جاتا ہے، پھر اس سے اپنی آسائشوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ان فاؤنڈیشن میں کام کرنے والوں کی تنخواہوں کو ختم کر دینا چاہیے تاکہ ہر شخص واقعی طور پر حقیقی معنوں میں خدمت کرے۔ اس فاؤنڈیشن کے بانی کو چاہیے کہ وہ دنیا کے کام جاری رکھے اور اپنی آمدنی کسی پیشہ ورانہ ذریعۂ معاش سے حاصل کرے۔ اسے اپنی آمدنی میں سے ایک حصہ فاؤنڈیشن میں خدمت کے لیے وقف کرنا چاہیے۔

یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ اپنا سب کچھ لٹا کر وہاں بیٹھ کر غریبوں کے نام پر پیسہ لوٹنا شروع کر دو۔ میں اس لیے ان فاؤنڈیشنز کو کسی قسم کا عطیہ دینے کے بجائے خود کسی ضرورت مند کو ڈھونڈ کر اسے تحفے کے طور پر پیسے دیتا ہوں، کیونکہ

میرا یہ ماننا ہے کہ ہمیں شرم آنی چاہیے کہ اگر کسی کو ضرورت ہے تو ہم اسے بھیک کے نام پر دیں کہ وہ یہ سوچے کہ میرے پر ایسا زمانہ آیا ہے کہ میں بھیک لے رہا ہوں۔
بجائے اس کے، ہمیں اس کے پاس جانا چاہیے، ایک پیارا سا تحفہ تیار کر کے جس چیز کی اسے ضرورت ہو، اور اسے کہنا چاہیے کہ "میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں"—اور وہ بھی کسی قسم کی ریاکاری کے بغیر۔ کیونکہ لوگوں میں ریاکاری بہت ہے، وہ تو مدد بھی دنیا کو بتانے کے لیے کرتے ہیں کہ "میں نے اللہ کے لیے اس کی مدد کی ہے اور اس سے بدلہ نہیں مانگا۔"

2025/02/13

"دنیا صرف اس بندے کو یاد رکھتی ہے جو یاد رکھے جانے کے لیے اپنا آپ لکھ کر جاتا ہے۔"

آج میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ایسا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں جو عام طور پر ان لوگوں کے ساتھ خاص طور پر پیش ہے، جو اپنی کوئی کتاب لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے آج تک جن جن لوگوں سے کہا ہے کہ کچھ لکھو، تو وہ پہلا سوال یہ کرتے ہیں کہ "کیا لکھیں؟" وہ کہتے ہیں: "ہمیں کچھ آتا ہی نہیں، تو ہم کیا ہی لکھیں؟"
یہ مسئلہ ادیبوں کے ساتھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی ہم کچھ لکھنے لگتے ہیں، تو ہمیں کوئی نئی سوچ ہی نہیں آتی، اور یوں وہ لکھ نہیں پاتے۔ اور جب وہ کسی ایسی جگہ ہوں جہاں لکھنے کا سامان موجود نہ ہو تو اس وقت ان کو ایسی ایسی سوچیں آ رہی ہوتی ہیں کہ کمال ہی ہو جائے، مگر پھر جیسے ہی وہ لکھنے بیٹھتے ہیں، ان کی وہ سوچیں غائب ہو جاتی ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ زیادہ تر ادیب کتابیں دو وجہ سے لکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اس کتاب سے لاکھوں کما سکیں، اور دوسری وجہ وہ جو آج ہر شخص نے خواب سجا رکھا ہے، کہ اس کی واہ واہ ہو جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس کتاب سے اسے کوئی بڑا پروٹوکول ملے۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ ان کا سارا دھیان اس طرف ہو جاتا ہے، اور وہ کچھ بھی نہیں لکھ پا رہے ہوتے۔

پہلی بات، کبھی بھی یہ سوچ کر نہیں لکھنا چاہیے کہ ہماری واہ واہ ہو جائے یا یہ کہ آپ اس کو کاروبار کا ذریعہ بنائیں۔ کتاب لکھیں، مگر دو چیزوں کے لیے: ایک، اپنا احتساب کرنے کے لیے، کیونکہ جب آپ لکھتے ہیں تو اصل میں آپ اپنا آپ باہر نکال رہے ہوتے ہیں۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ آپ خود کو جاننا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی لیے جب بھی میرے ساتھ کوئی خاص واقعہ ہوتا ہے اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہوتی کہ اصل مسئلہ کیا ہے، تو میں اسے لکھ لیتا ہوں۔ پھر اس معاملے کو کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور بعد میں فیصلہ کرتا ہوں۔

جب انسان کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آتا ہے، تو اس کا دماغ اس تبدیلی کو اپنے مطابق سنبھالنے لگ جاتا ہے، اور ہر سیکنڈ اس کے دماغ میں ہزاروں سوچیں ابھرنے لگتی ہیں۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ انسان کا اپنا دماغ خود کنفیوز ہو جاتا ہے، اور وہ صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا۔

دوسری وجہ نصیحت کرنے کے لیے ہے۔ میں نصیحت کو بھی علم ہی تصور کرتا ہوں، کیونکہ جب آپ اپنی لکھی ہوئی کوئی تحریر کسی کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں، تو جو پڑھنے والا آپ کی تحریر سے نصیحت حاصل کرتا ہے، وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے۔

جب میں نے سوچا کہ میں یہ کتاب لکھوں، تو میں نے سوچا کہ اس کتاب کی ترتیب کیا رکھنی ہے؟ اس کتاب میں کیا لکھنا ہے؟ مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ پھر میں نے سوچا کہ اس کو بالکل سیدھا لکھوں گا، تاریخ کے حساب سے، کیونکہ تاریخ

ایک ایسا حوالہ ہے جس سے یہ بھی پتا چل جاتا ہے کہ یہ بات کب لکھی گئی تھی، اور دوسرا، بعد میں ایک مخصوص مقام ڈھونڈنے میں آسانی ہوتی ہے۔

جب بھی میں لکھنا شروع کرتا ہوں، تو زیادہ تر میرا کوئی ارادہ نہیں ہوتا کہ میں نے کس موضوع پر لکھنا ہے۔ میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں، پھر جیسے جیسے جو جو بات میرے ذہن میں آتی جاتی ہے، میں اسے لکھتا جاتا ہوں۔ جب میں اچھے سے لکھ کر فارغ ہو جاتا ہوں، تو میں اس کو ایک دفعہ پڑھتا ہوں۔ پھر جو کچھ میں نے لکھا ہوتا ہے، اس کا مرکزی خیال نکال کر اسے سب سے اوپر لکھ دیتا ہوں۔ اس طرح میں آرام سے بہت کچھ لکھ لیتا ہوں۔

اگر ایک بندہ سوچ سوچ کر لکھنا شروع کرے گا، تو وہ اصل میں اپنا اصل کبھی نہیں لکھ سکے گا۔ وہ بار بار اسی سوچ میں پڑا رہے گا کہ "پتا نہیں یہ پڑھنے والے کو پسند بھی آئے گا کہ نہیں؟" میں ایسا نہیں سوچتا۔ میں وہ لکھتا ہوں جو میں ہوں۔ مجھے ایک جملہ یاد آیا: "اگر آپ بدصورت ہیں تو بس مان لیں کہ آپ بدصورت ہیں۔" اس لیے جو اصل میں آپ ہیں، وہ لکھیں۔ مثال کے طور پر، ایک انسان تین طرح سے ہنستا ہے۔

ایک، جب اس کے پاس واقعی اصل میں ہنسنے کی وجہ ہو۔ جب وہ اپنی اصل میں ہنستا ہے، تو وہ ہنسی اس کو واقعی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے، اور یہی وہ اصل ہے جو اگر آپ لکھیں گے، تو دوسرے کو فائدہ دے نہ دے، آپ کو ضرور دے گی۔

دوسری ہنسی وہ ہوتی ہے جو انسان تصویر بنانے کے وقت ایک جھوٹی ہنسی بناتا ہے۔ اس سے نہ صرف وہ اپنا نقصان کرتا ہے بلکہ دوسروں کا بھی کرتا ہے۔ مثلاً، ایک انسان کی ایک دعوت پر جھوٹی مسکراہٹ والی تصویر بہت سے کمزور لوگوں کے دلوں میں یہ بات پیدا کرتی ہے کہ "ہمارے ساتھ یہ بہت برا ہوا ہے کہ ہم ایسے مواقع حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔" ان کے دل میں یہ کٹھن بات پنپتی رہتی ہے، اور حسد اور بعض اوقات نفرت میں بدل جاتی ہے۔

تیسری ہنسی وہ ہوتی ہے، جو ایک انسان اپنے اندر کا غم چھپانے کے لیے ہنستا ہے۔ یہ ایسی ہنسی ہوتی ہے، جسے پہلی اور دوسری قسم کا مکسچر کہہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ ہنسی جھوٹی تو ہوتی ہے، مگر وہ اس سے خود کو خوش کرنے اور دوسروں کو دکھاوا کر کے خود کو خوش ظاہر کرنے کے لیے ہنستا ہے۔

ایک بہت خاص سوال جو مجھ سے اکثر وہ لوگ لازمی پوچھتے ہیں، جن کو میں کہتا ہوں کہ کچھ لکھو، وہ یہ ہے کہ "اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

ایک تو وہ فائدہ ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں: اپنا احتساب کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اور ایک اس کا فائدہ یہ ہے کہ آپ باقی رہ جاتے ہیں۔ آج سے سو سال پہلے بھی ہمارا کوئی وجود نہیں تھا، اور آج سے سو سال بعد بھی نہیں ہو گا۔ اس وقفے کے درمیان ہم تھوڑی دیر کے لیے آتے ہیں۔ ہم سے پہلے بھی پتا نہیں کتنے لوگ اس دنیا میں آئے اور ہمارے بعد بھی پتا نہیں کتنے لوگ آنے ہیں، مگر دنیا صرف اس بندے کو یاد رکھتی ہے جو یاد رکھے جانے کے لیے اپنا آپ لکھ کر جاتا ہے۔

آج ہم جسے سب سے پرانا جانتے ہیں، وہ کچھ نہ کچھ اپنے بارے میں لکھ کر گیا ہو گا۔ ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کے لکھنے کی وجہ سے بچا ہو، مگر ایسی قسمت بہت تھوڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔

اچھا، میں نے یہ بھی حساب لگایا کہ ہم میں سے زیادہ تر لوگ خود کچھ کرنے کے بجائے ایسی قسمت کے انتظار میں یہ سوچ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ "اگر اس کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے، تو میرے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔" ایسا نہیں ہوتا۔ بجائے قسمت کے بھروسے بیٹھنے کے، خود کچھ کرنا چاہیے۔

لوگ اسی قسمت کا انتظار کرتے کرتے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہم اچھے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں، مگر وہ اچھا وقت کبھی نہیں آتا۔ جب موت سر پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، تو وہ افسوس کرتا ہے کہ "افسوس! مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اچھا وقت تو وہ تھا جو گزر گیا۔"

جیسے جب ہم بچے تھے، تو ہم چاہتے تھے کہ جلدی جلدی بڑے ہو جائیں تاکہ باہر گھومنے پھرنے جائیں، کوئی ہمیں روکے نہیں۔ پھر جب بڑے ہو جاتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ "کاش ہم اپنے بچپن میں لوٹ سکیں!" تیس سال کے بعد انسان ہر طرف سے گھیرا جاتا ہے، بیماریاں، ٹینشن، اور مرنے کے بعد وہ بھی ان اربوں انسانوں میں سے ایک ہو جاتا ہے، جو دنیا میں آیا اور بے کار چلا گیا۔ نہ اپنے لیے کچھ کر سکا، نہ کسی کو کوئی فائدہ دے کر جا سکا۔

2025/02/14

"جب باتیں شروع ہوں گی، تو شروع کہیں سے ہوں گی اور ختم کہیں اور ہوں گی!"

آج میرے پاس بتانے کو اتنی ساری چیزیں ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آ رہی کہ کہاں سے شروع کروں۔ سب سے پہلی چیز تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہوئی ہے وہ یہ کہ میرے کالج کے دوستوں کے ساتھ کال پر بات چل رہی تھی۔ ہم پنجاب کالج لاہور کے کیمپس 8 میں پڑھتے تھے کالج کے وقت بھی ہماری کلاس میں ایک لڑکا ہوتا تھا جو بہت گالیاں نکالا کرتا تھا، اور وہ مذاق مذاق میں ابھی بھی یہی کام کر رہا تھا۔

میں اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ اس سے کیا ہی فائدہ ہوتا ہے؟ اگر ہم غور کریں تو کوئی فائدہ نہیں۔ جسے گالیاں دی جائیں، وہ بھی برا مان جاتا ہے، اور جنہیں خوش کرنے کے لیے دی جاتی ہیں، وہ بھی ایک وقت کے بعد چھوڑ جاتے ہیں۔

پھر آپ اور آپ کی دی ہوئی گالیاں ہی اکیلی رہ جاتی ہیں ،سب بے کار۔ یہ ایک لمحے کے لیے ایسا ہی فائدہ ہے جیسے آج کل جب کسی شخص کا کسی گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہو جائے، تو دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے۔ جب بات پولیس تک پہنچتی ہے، تو پولیس کہتی ہے، "جس کی غلطی ہے، وہ 20 ہزار دے اور جس کی نہیں ہے، وہ 10 ہزار دے۔" اور یہ پیسے لے کر وہ دونوں سے کہتی ہے کہ "دفع ہو جاؤ!" دونوں اپنے اپنے زُعم میں خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ ہم نے اگلے کا نقصان کر دیا۔

اچھا، ایک چیز تو یہ کہ دونوں نے نقصان ایک دوسرے کا کیا۔ دوسرا، ایک پولیس والا نکتہ ہے جو ہر طرف سے فائدے میں رہتی ہے۔ ایسے ہی ہمارے مسئلے تو تھوڑی دیر کے لیے ہوتے ہیں، اور ہم آپس میں ایک دوسرے کا نقصان کرنے کے لیے مکمل طور پر تلے ہوتے ہیں۔ ایک تو اپنے تعلق خراب کرتے ہیں، دوسرا اپنا بھی نقصان کر لیتے ہیں اور اگلے کا بھی کر دیتے ہیں۔ مگر ہمارے جھگڑے میں کوئی نہ کوئی ایسا بیٹھا ہوتا ہے جو ہر طرف سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ہمیں کتوں کی طرح لڑتے دیکھ کر انجوائے کرتا ہے۔

کل رات بھی گھر میں دعوت تھی اور گھر مہمان آئے ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ ایک شخص بھی آیا تھا جسے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیر، بابا بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے نہیں پوچھا، تو میرا بھی نہیں بنتا تھا۔ وہ شخص اتنا زیادہ عجیب تھا کہ میں کھانے کے درمیان بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ مرد ہے یا عورت؟ میں نے اپنے انکل سے پوچھا کہ آپ کو کیا لگتا ہے کہ یہ کیسا لگ رہا ہے؟ وہ کہتے، "مجھے تو کھسرا الگ رہا ہے!" اس لیے براہ مہربانی آپ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں آپ بہت پیارے ہیں کسی کی طرح بننے سے آپ الگ ہی مخلوق لگنے لگتے ہیں۔

وہاں سب اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھے، اور ہم دونوں سائڈ پر بیٹھ کر سب کو انجوائے کر رہے تھے کہ یہ کیا ہی عجیب باتیں کر رہے ہیں! اچھا، آپ بھی نوٹ کر لیں کہ جب بھی باتیں شروع ہوں گی، تو شروع کہیں سے ہوں گی اور ختم

کہیں اور ہوں گی۔ رات کو بھی ایسا ہی ہوا۔ باتیں شروع پیار محبت سے ہوئیں اور ختم اس بات پر ہوئیں کہ کتوں کو سب سے زیادہ کس نے بھگایا ہے؟ بھلا، اگر ان کے سر سے دیکھیں تو پیار محبت کا کتوں سے کیا ہی تعلق ہے؟

بہر حال، رات کا کھانا کھانے کے بعد آدھی رات کو میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ صبح کے قریب تو مجھے بخار اور سردی لگنے لگی۔ خیر، میں نے دو رضائیاں لے لیں، پھر جا کر مجھے تھوڑا سا سکون آنے لگا۔ پھر میں سو گیا اور دیر سے اٹھا کیونکہ پوری رات طبیعت خراب رہی۔

اٹھنے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر نیچے آیا، تو سب سے پہلے میری چھوٹی بہن مانی اچھل کر میرے پاس آ گئی۔ اس کی میرے ساتھ ایک خاص قسم کی محبت ہے۔

خیر، کیونکہ آج جمعہ تھا، اس لیے جمعہ پڑھ کر میں نے گھر سے نکلنا تھا۔ میں نے ایک اور چیز بڑی نوٹ کی ہے کہ انسان خدا کے معاملے میں بھی بڑا دھوکے باز ہے۔ ایک انسان سمجھتا ہے کہ وہ جو مرضی کرتا پھرے اور آخر میں معافی مانگ کر معافی حاصل کر لے گا۔

میں نے کچھ لوگوں کو لڑکیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیکھا ہے۔ ادھر وہ نیم برہنہ لڑکیوں کے ساتھ مزے کرتے ہیں، اور اگلے دن توبہ کر کے پھر اگلے دن مزے لینے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ حال تقریباً ہر جگہ ہے۔

خیر، میں گھر سے بابا کے ساتھ نکلا اور لینگوئج سینٹر پہنچ گیا۔ وہاں پر لیکچر کے دوران کام نہ کرنے پر بہت زیادہ عزت افزائی ہوئی۔ خیر، کیونکہ غلطی ہماری ہی تھی، اس لیے کیا ہی کہہ سکتے تھے!

وہاں سے ہمارا پلان کھانے کا بن گیا۔ سینٹر سے نکلنے کے بعد ہم ایک ریسٹورنٹ پہنچے۔ میرے ساتھ والوں کا روزہ تھا، اس لیے ہمیں افطاری کا انتظار کرنا تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد روزہ کھلا اور ہم نے کھانا کھایا۔ یہ میری باری تھی، اس لیے پیمنٹ کی ذمہ داری بھی میری ہی تھی۔

ہوا یہ کہ میرے پاس کیش میں صرف 1000 روپے تھے، جس کا مجھے علم نہیں تھا، اور باقی پیسے آن لائن تھے۔ میرے ساتھ والوں نے باقی پیسے پے کر دیے، مگر وہاں ایک عورت بیٹھی تھی جو نہ ہمیں جانتی تھی اور نہ ہم اسے، مگر وہ مذاق اُڑانے لگ گئی۔ بعض اوقات ماحول ایسا بن جاتا ہے کہ اپنے بھی مذاق بنانے لگ جاتے ہیں، اور اس وقت میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ نہ مجھے جواب دینے دیا گیا، نہ خود دیا کہ بی بی! یہ ہمارا معاملہ ہے، تم کون ہوتی ہو ہمارے معاملات میں دخل اندازی کرنے والی؟

وہ کہنے لگی کہ میں پروفیشن میں ٹیچر ہوں! مجھے وہیں سمجھ آگیا کہ کیسی ٹیچر ہو گی! بعض اوقات کچھ لوگوں کو دوسروں کے معاملے میں ٹانگ آڑانے کا زیادہ ہی شوق ہوتا ہے اور بعض لوگ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ وہ طلبہ سے ایسے سوال کرنا شروع کر دیتے ہیں جو ان کے زمانے کے ہوتے ہیں، جن کا آج استعمال ختم ہو چکا ہے، اور پھر یہ رونا ڈال دیتے ہیں کہ آج کے بچے بالکل نکمّے اور بدتمیز ہو گئے ہیں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ دنیا بڑی تیزی سے بدل رہی ہے، تم بھی بدلو! تم تو اُسی جگہ پر پھنسے ہوئے ہو۔

جیسے مجھے ایک واقعہ یاد ہے۔ ہم کالج کے لیے بس کا استعمال کرتے ہوتے تھے، اُس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم سب دوست بس میں سوار ہو گئے۔ وہاں ایک بڑی عمر کا شخص تھا، بوڑھا اتنا زیادہ بھی نہیں تھا، مگر ہمیں یونیفارم میں دیکھ کر ہم سے ٹیسٹ لینا شروع کر دیا۔ بھلا، ہم بائیو کے طلبہ، تمہارے زمانے کی چیزیں کیسے جان سکتے ہیں؟ وہ ہم سے پوچھ رہا تھا کہ بتاؤ، ایک رسی میں کتنے دھاگے مڑے ہوئے ہوتے ہیں؟ بھلا ان سے پوچھا جائے کہ کیا ہم کالج کپڑے بنانے جاتے ہیں؟ اس کا جواب تو شاید ٹیکسٹائل کے سٹوڈنٹ کو بھی نہ پتا ہو!

ایسے ہی کچھ لوگوں کو چول مارنے کی عادت ہوتی ہے کہ بندہ کہے بھی تو کیا کہے! اور لوگ تو ان سے بھی بڑھ کر—وہ بندہ جس کو مکھی بھی نہیں مارنی آتی، وہ بھی ایسے وقت میں شیر بن رہا ہوتا ہے کہ کیا ہی کہا جائے! چاہے جواب اسے خود بھی نہ آتا ہو اور ہوتے سارے دو چپیڑوں کی مار ہیں۔

بھلا اگر ہم ان سے سوال کریں کہ بتاؤ، سیل کے اندر مائٹو کونڈریا کا کیا کام ہوتا ہے؟ تو ان کی بکری مر جانی ہے! پھر فوراً کہیں گے، ہم لوگوں نے تمہاری کتابیں نہیں پڑھیں، ہم ان پڑھ ہیں! تو خود بھی تو یہ سمجھو کہ جس کو کسی چیز کا علم نہیں، وہ اس چیز سے لاعلم ہے، یعنی اُس چیز کا ان پڑھ ہے! کیونکہ جس کو جو چیز آتی ہوتی ہے، وہ آسان لگتی ہے، اور جو چیز نہیں آتی، وہ مشکل لگتی ہے۔

خیر، تب تو ہم لوگ چھوٹے ہوتے تھے، اب ہم انہیں لاجواب کر دیتے ہیں! کیونکہ جو شخص جس پیشے سے تعلق رکھتا ہے، اُس سے اُسی سے متعلق سوال کرو، یہ زیادتی تو نہ کرو!

میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے کہ آج کے دور میں صرف وہ شخص ہی آپ سے خوش ہو گا جس کو اس کی مرضی کی بات ملے گی۔ اور اگر کوئی شخص یہ سمجھ جائے کہ اس کے مرنے کے بعد اسے کتنی جلدی بھلا دیا جائے گا، تو وہ لوگوں کو متاثر کرنا ہی چھوڑ دے گا۔ کیونکہ ایسے لوگ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بہت بڑے علم رکھنے والے ہیں حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیے کہ اس سے ہمیں کیا فائدہ ہو گا کہ رسی میں کتنے دھاگے مڑے ہوتے ہیں؟

اور ہاں، جب آپ عمر میں آگے بڑھتے ہیں، تب آپ کو سمجھ آتی ہے کہ اگر آپ لوگ متحد نہیں ہوتے—جیسے میں آج نہیں تھا، اکیلا پڑ گیا تھا—تو ایسے مقام پر بعض اوقات آپ کو ہار کا سامنا ہی کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم کمزور ہیں یا نکمے ہیں۔

بس ہمیں ایک چیز یادرکھنی چاہیے کہ اگر ہمیں ایک دفعہ کامیابی مل گئی ہے، تو ضروری نہیں کہ اگلی دفعہ بھی ملے اگلی دفعہ کے لیے کامیابی کی کوشش ضرور کریں۔ مگر یہ بھی یقین رکھیں کہ اگر ناکام ہو گئے، تو اس سے کیسے نمٹنا ہے۔

مجھے وہ بچہ بہت اچھا لگتا ہے جو اپنے فیل ہونے پر بہانہ بہت اچھا بنانا جانتا ہو، کیونکہ وہ یہ سیکھ چکا ہے کہ اپنی مشکل سے کیسے نمٹنا ہے۔ جو آج کے لوگوں کی صورتحال بن گئی ہے، اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔

میں نے یہ سیکھا ہے کہ جو جیسا ہے، اسے اس کی حد میں رکھو اور اپنا آپ سب سے پہلے رکھنا سیکھو۔ کیونکہ اگر آپ خود کو پہلے پیش نہیں کرو گے، تو سب آپ کو پیچھے پھینک کر خود آگے نکل جائیں گے۔ اسی لیے میں یہ کبھی نہیں کہتا کہ فلاں بندہ میرا آئیڈیل ہے—شاید ہی کبھی کہا ہو، مگر دل سے کبھی نہیں مانا۔

میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ جو میں ہوں، بہترین ہوں۔ کیونکہ جب آپ کسی کو اپنا آئیڈیل کہتے ہیں، تو اصل میں آپ یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ یہ بندہ مجھ سے بہت بڑا ہے۔ اگر کسی کا کام مجھے اچھا لگتا ہے، تو میں کہتا ہوں، بہت اچھا کام کیا ہے! مگر کسی کا اچھا کام، اسے میرا آئیڈیل نہیں بنا سکتا۔

بات تھوڑی سخت ہے، اسی لیے اپنی مثال دے کر سمجھا رہا ہوں تاکہ آسانی سے سمجھ آ جائے۔

اتنی ساری باتوں کے ساتھ ساتھ مجھے آخر میں ایک بڑی مزاحیہ بات یاد آئی جو میرے انکل نے مجھے سنائی تھی۔

کہ ان کے پرانے محلے میں ایک کمہار رہتا تھا۔ جب بھی اسے کوئی دعوت کا پیغام دیا جاتا، وہ اپنا پورا ٹبر اٹھا کر لے آتا۔ لوگ مجبور ہو کر اسے دعوت کے کارڈ پر بڑا سا لکھ کر دیتے کہ "صرف ایک بندہ مدعو ہے!" مگر اس کی پھر بھی یہی کوشش ہوتی کہ اگر ہو سکے، تو اپنے مہمان بھی انہی کی دعوت سے پورے کروا لیے جائیں!

2025/02/15

"انسان کو اپنا بچپن کبھی نہیں مارنا چاہیے"

آج کا میرا دن میری زندگی کے بہترین دنوں میں سے ایک تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے دن بھی بے کار ہوتے ہیں کیونکہ جو وقت ہمیں ملا ہے، وہ ایک وقت ختم ہو جانا ہے، اور شاید ہم تو افسانوں میں بھی زندہ نہ بچیں۔ شاید ہی ہماری نسل میں ہمارا نام بھی کسی کو پتا ہو۔ ایک وقت ہمارا وجود بھی ایک شک میں بدل جائے گا۔ اس لیے تمام وقت اور ہر لمحہ ایک بہترین تحفہ ہے، اور اسے ہمیں جینے کی مکمل کوشش کرنی چاہیے۔ مگر وہ اچھے دنوں سے مراد وہ والے دن لے رہا ہوں جن دنوں میں میں بہت زیادہ خوش ہوں، اور خاص کر وہ دن جب آپ کو اپنے پرانے دوست مل جائیں جو کبھی آپ کے ساتھ پورا پورا دن گزارا کرتے تھے۔

خیر، یہ تو ہر گروپ میں ایک عام بات ہوتی ہے کہ دوستوں میں ملنے کے وقت اختلاف ہی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی کہانی ڈال رہا ہوتا ہے، کبھی کوئی۔ خیر، آج بھی ایسا ہی ہوا۔ میں شروع کرنے سے پہلے اپنے ان دوستوں کا تعارف کرواتا ہوں جو میرے ساتھ اسکول میں پڑھتے ہوتے تھے۔

جب میں تقریباً 6 یا 7 سال کا ہوا تو ایک آنٹی ہمارے گھر آئیں اور انہوں نے کہا کہ "یہ بڑا ہو گیا ہے، اسے اسکول کیوں نہیں ڈالتے؟" خیر، مجھے یہ بات تو یاد ہے مگر یہ یاد نہیں کہ وہ آنٹی کون تھیں۔ میرا ایک کزن تھا، اس کا بھی اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا۔ وہ میرے پاس آیا اور شیخی مارنے لگا کہ "میں تو اسکول جاتا ہوں۔" مجھے لگا کہ پتا نہیں یہ اسکول کیا ہے جہاں سب جاتے ہیں۔ میں نے گھر آ کر ضد ڈال دی کہ میں نے اسکول جانا ہے۔ میں نے گھر میں لڑائی ڈال دی، رونا شروع کر دیا اور کہا، "ابھی جانا ہے اسکول!"

خیر ،امانے اسکول میں میرا ایڈمیشن کروادیا۔تب ہم کوٹ عبد المالک میں رہتے تھے،اور میرا ایڈمیشن سٹار لائٹ اسکول میں ہوا،اور یوں میرے اسکول کی ابتدا ہو گئی۔چند ہی دنوں میں اسکول کی اصلیت میرے سامنے آگئی اور میں تو پھنس ہی گیا ایسی جگہ ،جہاں سے نکلنا میرے لیے عذاب ہی بن گیا۔کیونکہ یہ قسمت میری شروع سے خراب رہی ہے کہ مجھے ساری ہی غیر تجربہ کار فیمیل ٹیچرز ملیں،اور ایسا صرف میرے ساتھ نہیں ہوا،سب کے ساتھ ہی ایسا ہوا۔

خیر ،سٹار لائٹ اسکول کی بہت زیادہ باتیں مجھے یاد نہیں۔ایک واقعہ جو میرے ذہن میں ابھی ہے،وہ میرے آخری دنوں کا واقعہ ہے جب میں پہلی کلاس میں تھا اور وہاں سے چھوڑ رہا تھا۔اس وقت ہمارا گنتی کا ٹیسٹ ہوا،ایک سے لے کر بیس تک۔میں نے کوئی سات تک تو گنتی لکھ لی،آگے ایک آدھا لفظ ادھر ادھر سے دیکھ لیا،ایک آدھے ٹیچر سے پوچھ لیے، باقی کا خدا ہی حافظ ہو گیا۔اور میں نے بھی اسکول کو خدا حافظ کہہ دیا کیونکہ ہم لوگ کوٹ عبد المالک سے بیگم کوٹ آ گئے۔

وہاں عنایت ہائی اسکول میں میرا ایڈمیشن ہونا تھا۔انہوں نے بھی میرا انٹری ٹیسٹ لے لیا،اور میں تو ٹیسٹ سے ویسے ہی چالو تھا۔خیر ،حالانکہ بابا میرے ساتھ بیٹھے تھے،وہ بتا بھی رہے تھے جہاں مجھے مشکل ہو رہی تھی،مگر میں اتنا تنگ تھا کہ میں نے لکھنے سے انکار ہی کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ "مجھے کچھ آتا ہی نہیں" حالانکہ میں لکھ سکتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسکول والوں نے کہا کہ "اسے تو ہم نے پہلی میں ہی رکھنا ہے۔"

خیر ،مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔انہوں نے ہمیں کوئی 7،8 کتابیں لگا دیں۔پرانے اسکول میں ہم نے بس 3 کتابیں ہی پڑھی تھیں: اردو،انگلش اور میتھ۔اور یہاں تو کمپیوٹر،جنرل نالج،سائنس،معاشرتی علوم اور جغرافیہ اور پتا نہیں کیا کیا۔خیر ،پہلے دن ہی مجھے ایک عورت نے ڈانٹ کر تھپڑ مار کر بٹھا دیا کیونکہ میں کوئی شرارت کر رہا تھا۔

اس کے بعد میں اپنی کلاس میں داخل ہوا اور پہلی دفعہ میری ملاقات وہاں ایک لڑکے سے ہوئی جس کا نام فائیک تھا۔ اس سے میری دوستی ہو گئی، اور اس کے بعد آہستہ آہستہ باقیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت اس لیے نہیں ہوئی تھی کیونکہ باقی میرے کلاس میں پہلے دن سزا میں کلاس سے باہر تھے۔

وہ لڑکا جس سے میں اس سکول میں سب سے زیادہ تنگ رہا ہوں، جس نے میرا اسکول میں رہنا مشکل کر رکھا تھا، وہ اویم تھا۔ آج جب ہم ملے، وہ بھی تھا، مگر اب تو وہ بہت تبدیل ہو گیا ہے مگر مکمل نہیں۔ ابھی بھی وہ تھوڑا شیطانی کرنے والا ہی ہے

ایک میرا دوست ثاقب تھا، جس کی کچھ عادتیں باقیوں سے الگ تھیں۔ وہ ہمیشہ زیادہ نہیں بولتا تھا مگر مذاق کرتا ہوتا تھا۔ اس کی سب سے زیادہ مزاحیہ چیز اس کی اردو ہوتی تھی جو وہ ٹیسٹ میں لکھا کرتا تھا۔ جب بھی ہمارا ٹیسٹ ہونا، اگلے دن ہماری ٹیچر خاص کر اس کا ٹیسٹ ہمیں پڑھ کر سنانا کہ جو اس نے اردو کا جنازہ نکالا ہونا۔ وہ بھی آج آیا ہوا تھا۔

ایک میرا دوست سمیع ہوا کرتا تھا۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ یہ ہماری کلاس کا کب حصہ بنا، مگر بعد میں اس سے بھی اچھا تعلق رہا۔ چھوٹے ہوتے میں اسے ایک عجیب انسان ہی سمجھتا تھا کیونکہ وہ بڑی الیکٹرانکس کی چیزیں اسکول لے کر آیا کرتا تھا اور سب کو دکھاتا تھا۔ کیونکہ ہم نے وہ چیزیں کبھی دیکھی نہیں ہوتی تھیں، تو ہم اس سے بہت حیران ہوا کرتے تھے۔

اور ایک خاص ہمارا دوست حنین۔ یہ وہ خاص لڑکا تھا جو چھوٹے ہوتے ہماری کلاس کا "ٹاپر" تھا۔ ہمیشہ اول پوزیشن اس کی ہی آتی تھی۔ ایک لڑکی آمنہ نام کی، اس کی پوزیشن اس کے بعد ہوتی تھی۔ مجھے تو اتنا زیادہ وہم پڑ گیا تھا کہ شاید میں ان دونوں سے ہی کمزور ہوں۔ مجھ سے جب بھی کوئی پوچھتا کہ "کون سی پوزیشن لو گے؟" میں کہتا تھا کہ "پہلی اور دوسری کے علاوہ بعد میں ہی آؤں گا۔"

سمیع اور حنین بھی آج آئے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے دوست تھے اسکول میں میرے۔ ان پر بات پھر کبھی کریں گے۔

خیر، ہم سب کی گروپ میں بات ہوئی۔ جس نے کہانی کروانی تھی، وہ کروا گیا، اور باقی ہم سب جو بچ گئے، ان کا منصوبہ بن گیا۔

حنین نے 4:30 پر فری ہو جانا تھا کیونکہ اس کی آج 4:30 تک کلاس تھی۔ میں آج فری تھا کیونکہ مجھے ہفتہ اور اتوار چھٹی ہوتی ہے۔ ثاقب بھی بہانے بنانے لگا، تو میں نے کہا کہ "آپ کو جو بھی کام ہیں، وہ 4:30 تک مکمل کر لو۔"

سمیع نے تو پہلے ہی ہمارے لیے ٹائم نکال لیا تھا اور باقی کام اگلے دن پر ڈال دیے تھے۔ سمیع نے مجھے کہا کہ "آپ میری طرف آ جائیں۔" اس وقت کوئی 3 بج رہے تھے۔

یہ میری سمیع کے ساتھ پچھلے 6 سال میں دوسری ملاقات تھی۔ اس سے پہلی ملاقات تھوڑے عرصے پہلے ہوئی تھی جب وہ مجھ سے ملنے اسپتال آیا۔ اسکول لائف کے آدھے میں ہی ہم لوگ الگ الگ ہو گئے تھے۔ اس کو میری آئی ڈی ملی تو اس نے مجھے میسج کیا سلام۔ میں نے بھی جواب میں "وعلیکم السلام" کہا۔ اس نے کہا، "کیا حال ہے؟" میں نے کہا، "الحمد للہ، آپ سنائیں؟" اس نے کہا، "فٹ" اور لکھا "وٹ سیپ؟"

میں نے پوچھا، "آپ کون؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" اس نے کہا، "بھول گئے ہو؟" میں نے کہا، "آپ یاد کروا دیں۔" وہ کہنے لگا، "آپ سے یہ امید نہیں تھی، معیز!"

میں نے کہا، "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، آپ اپنی پہچان کروا دیں۔" آگے سے کہنے لگا، "جان جان کہتے تھے، اب بھول بھی گئے؟ واہ معیز!" میں نے کہا، "نہیں یاد۔"

پھر کہتا، "کتنی گرل فرینڈز رکھی ہیں جو مجھے یاد نہیں کر پا رہے؟" میں نے کہا، "اوہ بھائی، ذرا دھیان سے بات کریں، براہِ مہربانی۔"

آگے سے میرے ساتھ ابھی بھی مذاق کر رہا تھا، کہنے لگا، "یہ میرے بھائی کی آئی ڈی ہے، آپ کو پتا تو ہے میں فیس بک یوز نہیں کرتی۔" میں ذرا غصے میں آ گیا اور میں نے کہا، "مجھے دوبارہ میسج نہ کرنا، تم جو بھی ہو!"

پھر وہ بولا، "سمیع ہوں، یاد آیا؟" میں نے کہا، "کون سمیع؟" کہتا، "قائد کا، آپ کا کلاس فیلو!" میں نے کہا، "میں قائد میں کبھی پڑھا ہی نہیں ہوں۔"

اس نے کہا، "اسکول میں، عنایت ہائی اسکول، سمیع اللہ ہوں!" میں نے کہا، "اوہ، اوکے، اب پہچان لیا ہے!" تصویر دیکھ کر مجھے لگے اسے کہیں دیکھا ہے کیونکہ شکل وقت کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ بدل جاتی ہے مگر میں اسے پہچان نہیں سکا۔ اس کے بعد میں نے اسے اپنا نمبر دیا اور ہماری بات ہوئی۔ کچھ دنوں بعد جب ہماری بات ہوئی تو اس نے کہا کہ "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں اس وقت اسپتال میں تھا، تو میں نے اسے وہیں بلا لیا، جہاں ہم 6 سال بعد ملے۔ اس کے بعد آج ملے۔ میں نے گھر سے نکل کر اس کی طرف جانا تھا۔ میں سپیڈو میں بہت عرصے بعد سوار ہوا۔ تو وہاں مجھے ایک جوڑا یاد آ گیا جسے میں نے ایک دفعہ سپیڈو میں دیکھا تھا۔ وہ عورت عورتوں والی جگہ پر کھڑی تھی اور اس کا شوہر یہاں مردوں والی جگہ پر بیٹھا تھا کیونکہ وہ بیمار لگ رہا تھا۔ ویسے کیونکہ عام طور پر جگہ نہیں ملتی مگر بیماروں کو دلوا دی جاتی ہے خاص طور پر۔

وہ عورت بار بار مڑ کر اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی اور اشاروں میں حال چال پوچھ رہی تھی کہ "سب ٹھیک ہے نا؟" اور وہ بھی اشاروں میں "ہاں" کا جواب دے رہا تھا۔

انہیں دیکھ کر مجھے سمجھ آیا کہ میاں بیوی میں اتفاق اور محبت کی یہ ایک بہترین مثال ہے کہ جس پر برا وقت آیا ہے، دوسرا اس کا بازو بن کر اسے سہارا دے رہا ہے۔

سپیڈو سے میں کوٹ عبد المالک اترا اور اس کو کال کی۔ وہ مجھے لینے آ گیا اور وہاں سے ہم ایک دکان پر گئے۔ اس نے مجھے بوتل پلائی اور پھر ہم اس کے گھر کی طرف چلے گئے۔

اسکول کے بعد وہ بہت بدل گیا تھا۔ وہ بدمعاش بھی بن گیا تھا، مگر ہماری ملاقات سے پہلے پہلے وہ بہت حد تک باز آ گیا تھا۔ اس کے گھر اس نے مجھے اپنی داستانیں سنائیں، جو بہت ہی زیادہ خونخوار تھیں، مگر اس کی باتوں سے ایک بات واضح تھی کہ وہ ناحق نہیں لڑتا تھا۔

ایک بات جو اس نے مجھے بتائی اور جو مجھے بہت پسند آئی، وہ یہ تھی کہ اس نے اپنی بہن کو بھی اوزار چلانا سکھائے تھے۔ یہ ایک بہت اچھی بات ہے کیونکہ آج لڑکیوں پر ہر جگہ ظلم ہی ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بھی ایک زبردستی زیادتی کا معاملہ بہت مشہور ہو گیا تھا، اس لیے میرا ماننا ہے کہ ایک لڑکی کی حفاظت کے لیے ایک مرد ہر وقت موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے اپنی حفاظت خود کرنی آنی چاہیے۔ اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ منہ توڑ جواب دے سکے۔

سمیع جتنا مرضی عجیب لگتا تھا مجھے، مگر ایک چیز تو ماننی پڑے گی، وہ چیزوں کا فیصلہ اچھا کر لیتا ہے۔

جب اس کے گھر سے آگے روانہ ہوئے تو اس نے مجھے کچھ دنوں پہلے کی ایک بات بتائی۔ اس کو اس کے محلے والوں نے بتایا کہ دو لڑکے ہر روز ان کے محلے آتے ہیں اور شاید چوری کرنے کے لیے جائزہ لے رہے ہیں۔

کہتا ہے کہ میں گھر آیا اور اپنی بائیک جان بوجھ کر لاک نہیں کی، پھر میں چھت پر جا کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا۔ وہ دونوں بھی تھوڑی دیر بعد اپنے وقت پر آ گئے۔ ان میں سے ایک بائیک کے پاس آیا اور اس کا ہینڈل ہلا کر دیکھا، تو دوسرے سے کہتا، "کھلا ہے!" وہ دونوں خوش ہو گئے اور انہوں نے مختلف چابیاں لگانا شروع کر دیں۔ ایک چابی بائیک میں لگ گئی۔

کہتا ہے کہ میں اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اوپر سے ہی اینٹ ماری۔ ایک لڑکے کے کندھے پر لگی اور وہ سنبھل نہ سکا۔ دونوں بھاگے، مگر گلی کے باہر کچھ لڑکوں کو میں نے پہلے سے ہی ٹھہرا کر رکھا تھا۔

کہتا ہے کہ جب تک میں نیچے آیا، تب تک انہوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا تھا۔ ہم نے ان دونوں کو بہت مارا۔ ان کے موبائل اور پیسے نکلوا لیے، کیونکہ ظاہری بات ہے کہ چور کے پاس ہر چیز چوری کی ہوتی ہے۔

اس نے بتایا کہ موبائل تو ہم نے موقع پر ہی توڑ دیے، پیسے وغیرہ چھین کر انہیں اچھا خاصا مارا، اور بعد میں چھوڑ دیا۔ کہتا ہے کہ وہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔

یہاں اس نے بتایا کہ جو پیسے ہم نے ان سے چھینے تھے، وہ کوئی 17 ہزار تھے۔ کہتا ہے کہ میں نے اس میں 5000 ہزار ڈال کر مسجد میں کام کروا دیا کیونکہ وہ پیسے ہم میں سے کسی کا حق نہیں تھے۔

خیر، اس کے بعد ہم دونوں حنین اور ثاقب سے ملے اور فیصلہ کیا کہ اومیم کے پاس چلیں گے۔ اس کے بعد ہم انارکلی پہنچے اور اومیم کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں جا کر اسے ملے اور اس کی دکان پر بیٹھ گئے۔ اس نے کھانے وغیرہ منگوا لیا۔

کافی دیر ہمارے درمیان اسکول سے متعلق باتیں ہوئیں، پرانے دن یاد کیے۔ ایک لڑکی کا ذکر بہت زیادہ ہوا، جس کا نام خولہ تھا۔ حالانکہ مجھے یاد نہیں کہ یہ لڑکی کون تھی جو ہماری کلاس میں اتنی زیادہ سرِفہرست رہی، مگر مجھے وہ یاد ہی نہیں۔ انہوں نے مجھے تصویر بھی دکھائی، مگر مجھے پھر بھی پتا نہیں چلا۔ اس سے مجھے سمجھ آیا کہ انسان جتنا مرضی سمجھدار ہو، یادداشت جتنی بھی مضبوط ہو، کچھ باتیں بھول ہی جاتا ہے۔

اور مجھے لگتا ہے بھول جانا ایک اچھی چیز ہے، کیونکہ اگر انسان کو بھولنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ تو اپنے پیاروں کا غم ہی نہ بھول پائے، جو اس دنیا میں نہیں رہے۔

ثاقب نے اپنی کہانی سنائی کہ جب اس نے اسکول چھوڑا تو وہ گورنمنٹ اسکول بڑی خوشی خوشی چلا گیا۔ کہتا ہے کہ میرا پہلا دن تھا، اسکول گیا تو استاد نے پوچھا، "کام آتا ہے؟"

اس نے کہا، "نہیں، کیونکہ میں آج پہلے دن آیا ہوں۔"

استاد شاید پہلے سے ہی غصے میں تھا، اس نے کہا، "اسے لمبا کر لو!"

کہتا ہے کہ دو لڑکوں نے میرے ہاتھ پکڑے اور دو نے پاؤں، اور استاد نے ڈنڈے سے میری تشریف لال کر دی۔

پھر کچھ لڑکوں نے جا کر کہا، "سر! یہ نیا ہے!" تب استاد کو سمجھ آئی۔

کہتا ہے، "اوہ اچھا اچھا، تم لوگ پہلے بتایا کرو!"

ہم سب بہت زیادہ ہنسے، مگر اگر غور کیا جائے تو ایک تلخ حقیقت نظر آتی ہے۔

ہمارے گورنمنٹ اسکولوں میں بچوں کو پڑھانے سے زیادہ ظلم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

یہ کوئی طریقہ نہیں ہے! ہمارے یہاں نظام ہی الٹا چلتا ہے۔

اب ہم لوگ ٹیچرز کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ ہمیں ہاتھ بھی لگائیں، کیونکہ سزا دینے سے کوئی چیز بچے کے ذہن میں داخل نہیں ہوتی۔

یا تو یہ ہو کہ اگر بچے کو کام نہیں آتا، اور اسے سزا دینے سے وہ آ جائے، تو پھر سمجھ آتی ہے۔

مگر بے فضول کی تکلیف سے کوئی فائدہ نہیں!

ہم تو کالج لائف سے ہی کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ ہمیں سزا دے۔

ہم کہتے تھے، "ہم پڑھنے آتے ہیں، یہ سزائیں لینے نہیں!"

بہر حال، کالج میں ہمیں سزا ویسے بھی بہت کم ملتی تھی، مگر ہم اس کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔

کافی دیر بیٹھنے کے بعد ہم وہاں سے واپسی کو نکلے۔ راستے میں ہمیں کچھ کتابیں لینی تھیں، تو ہم اردو بازار آ گئے، مگر بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی ہمیں نہیں ملیں۔

واپسی پر میں راستے میں اسپتال اتر گیا کیونکہ انہوں نے آج بلایا تھا۔ وہاں پر کام ختم کر کے انہوں نے مجھے گھر اتار دیا۔

آج کے دن سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا کہ انسان جتنا مرضی آگے بڑھ جائے، مگر وہ کسی نہ کسی طور پر اپنے بچپن سے جُڑا رہتا ہے۔

بچپن کی چیزیں ہمیشہ باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ہم لوگ آج آگے بڑھ گئے ہیں اور ہم نے بہت سی وہ چیزیں چھوڑ دی ہیں، جو کہیں نہ کہیں ہم آج بھی کرنا چاہتے ہیں۔

جیسے مجھے آج بھی مٹی سے کھیلنا بہت پسند ہے، جیسے بچپن میں تھا۔ مجھے تو کبھی موقع ملے مٹی میں کھیلنے کا، تو میں آج بھی بہت شوق سے کھیلتا ہوں، چاہے میں 20 سال کا ہو گیا ہوں، مگر میرا یہ شوق آج بھی ویسے ہی زندہ ہے جیسے بچپن میں تھا۔ اور میں نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کو اپنا بچپن کبھی نہیں مارنا چاہیے۔

2025/02/16

"ہم نے تقریباً سب کچھ کس قدر غلط طریقے سے سیکھا ہے"

آج جب سے میں اٹھا ہوں، سست ہوں۔ ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے میرے ساتھ، جب میں مکمل طور پر فری ہوتا ہوں، یعنی مجھے کوئی بھی سخت کام نہیں کرنا پڑتا۔ یہ بالکل ایک عام بات ہے، اور انسانی جسم رکھنے والا ہر شخص اس صورتِ حال سے ضرور گزرتا ہے۔

خیر آج میں نے ایک جملہ پڑھا: "یہ کتنا دردناک ہے کہ اگر آپ خود کو شیشے میں دیکھیں اور پہچان نہ سکیں کہ آپ کو دیکھنے والا کون ہے؟" آج ہم لوگ وہ بن چکے ہیں، جو لوگ ہمیں بنانا چاہتے تھے۔ اگر ہم اپنے سر سے دیکھنا شروع کریں تو پاؤں تک، ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو وہی نظر آئے گا جو دوسرے ہم سے چاہتے تھے۔

ہمیں کبھی اجازت نہیں دی جاتی، اور ہم پر ہمیشہ یہ پابندیاں لگائی جاتی ہیں کہ "یہ کرو اور یہ نہ کرو"۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ بچپن سے ہی مجھے بڑے بال رکھنے کا شوق تھا، مگر کبھی بھی کسی نے مجھے بڑے بال رکھنے نہیں دیے۔ میرے ایک سر نے تو ایک دفعہ میرے بڑے بال کاٹ ہی دیے اور کہا کہ "اچھے لوگ بڑے بال نہیں رکھتے"۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی کہ لمبے بالوں کا اچھے پن سے کیا تعلق ہے؟ وہی پرانے لوگ، جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں، وہ چھوٹے بال رکھتے تھے، تو ہم پر کیوں زبردستی کرتے ہو کہ ہم بھی چھوٹے بال رکھیں؟ مگر ہماری عمر دیکھ کر ہماری کہاں سنی جاتی ہے! بس ہماری باتوں کو دبا دیا جاتا ہے۔ ہمیں بچپن سے ہی وہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے "اچھی شخصیت" کہا جاتا ہے۔

ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ "وہ ایک اچھی شخصیت ہے، اس جیسا بنو"، اور ہم آہستہ آہستہ تعریف سننے کے لیے وہ بننا شروع کر دیتے ہیں۔

ہم وہ کرنے لگ جاتے ہیں جو ہم کبھی نہیں کرنا چاہتے تھے، جن چیزوں سے ہم نفرت کرتے تھے۔ اوپر سے جان بوجھ کر ایسی سختی کی جاتی ہے کہ ہماری کبھی ان چیزوں سے محبت بھی نہیں ہو پاتی۔ وقتی طور پر تو ہم لوگ وہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، مگر بعد میں جب ہم آزاد ہوتے ہیں، تو ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ دنیا میں کبھی نہ کبھی ہر کسی کو موقع ضرور ملتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ "دنیا میں ہر کسی کا وقت آتا ہے"۔

کل جب ہم دوست بیٹھے تھے، تو ایک ٹیچر کا ذکر ہوا جو تقریباً صرف چار مہینے کے لیے ہمیں پڑھانے آئی تھیں، جب ہم چوتھی کلاس میں تھے۔ اس نے آتے ساتھ ہی ہمیں اتنا مارنا شروع کر دیا کہ کیا کہیں! اب چوتھی کلاس کے بچے میں کتنی سمجھ ہوتی؟ اس نے ہماری ساری کلاس کو اتنا مارا کہ حنین، جسے کبھی کسی ٹیچر نے سزا نہیں دی تھی، اسے بھی مار پڑ گئی۔
میں نے تو گھر جا کر کہا کہ "میں نے اپنا سیکشن تبدیل کرنا ہے"۔ بابا میرے ساتھ اسکول آئے، پرنسپل نے کہانی گھما کر مجھے اسی سیکشن میں رکھا، مگر شاید ٹیچر کو ڈانٹا گیا، تو مار کم ہو گئی۔ مگر میں مکمل طور پر ان کی نظروں میں آ گیا۔ خیر، چونکہ بابا آئے تھے، اس لیے وہ مجھے کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں، مگر انہوں نے اپنا بدلہ رزلٹ میں مجھے کم نمبر دے کر پورا کر لیا۔ اس سے اسے کیا فائدہ ہوا؟

جب ہم کل بیٹھے، تو یہی بات ہو رہی تھی کہ "بہت بری ٹیچر تھی، بہت مارتی تھی"۔ یہ بات ہمارے دلوں میں بچپن سے بیٹھ گئی ہے، اور شاید اگر میں بوڑھا بھی ہو جاؤں، تب بھی یہی بات رہے گی کہ "بہت بری ٹیچر تھی"۔

مجھے بچپن سے اسکول میں عام گھریلو کپڑے پہن کر جانے کا شوق تھا۔ اسکول میں یہ یونیفارم کا عجیب ہی رواج ہے، ہمیں بچپن سے ہی اس عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اوپر سے یونیفارم میں ہم ویسے ہی بھیڑ بکریاں لگتے ہیں۔ یونیفارم پر وہ اپنی پبلسٹی کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے سروں سے لے کر پاؤں کے جوتوں تک اسکول کا ہی لوگو لگا ہوتا ہے۔ ہم بچپن سے ہی دوسروں کی پبلسٹی کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے لگتا ہے کہ ایک بچے کو اسکول یا کالج میں اپنے عام کپڑوں میں جانا چاہیے، اور اسکول میں ایک خاص کلاس ہونی چاہیے، جہاں بچوں کو لباس پہننے کے طریقے سکھائے جائیں۔ مگر ایسا کہاں ممکن ہے؟ اسکول جاتے ساتھ ہی بچوں پر درجن بھر کتابیں لاد دی جاتی ہیں، اور اتنا زیادہ ہوم ورک دے دیا جاتا ہے کہ کیا کہیں! اور اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا، بس ایک رٹا لگوا دیا جاتا ہے، اور بچوں کا دماغ اتنا ماؤف ہو جاتا ہے کہ وہ رٹا بھی بھول جاتے ہیں۔

ہمیں بچپن سے کبھی ہوش میں آنے ہی نہیں دیا جاتا۔ ہمیں کبھی بھی وہ کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی، جو واقعی ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اوپر سے ہماری اسمبلی کا تو کیا ہی کہنا! ہمیں جانوروں کی طرح قطاروں میں کھڑا کر دیا جاتا تھا، اور بس کچھ نظمیں اور ترانہ رٹوا دیا جاتا تھا۔ ہمیں سمجھ کچھ آتی نہیں تھی، اس لیے آج بھی 80 فیصد لوگوں کو ترانہ نہیں یاد، حالانکہ وہ بچپن میں ہر روز پڑھتے تھے۔ اور مطلب تو 99 فیصد لوگوں کو معلوم ہی نہیں کہ ترانے میں کیا کہا گیا ہے۔

ٹرپ کے نام پر ہمیں ہمارے جیسے ہی جانور دکھانے لے جایا جاتا تھا، اور ٹیچرز نے ہمیں جانوروں کے بارے میں کیا بتانا تھا؟ جب کہ انہیں خود ہی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ فلاں جانور کا کیا نام ہے! وہ تو خود حیران ہو رہی ہوتی تھیں کہ "یہ جانور تو ہم نے خود پہلی دفعہ دیکھا ہے!"

اوپر سے ٹرپ کے لیے ہمیں گھر سے اجازت خاک ملنی تھی، جب کہ ٹیچرز نے خود گھر میں رونا ڈال کر اجازت لی ہوتی تھی۔ اب آپ خود بتائیں، کیا آپ کے حالات میرے حالات سے بہت زیادہ مختلف تھے؟

زندگی میں بڑھتے بڑھتے، ہم اسی ماحول کے عادی ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور خود سے اتنا دور ہو جاتے ہیں کہ کبھی خود کو جان ہی نہیں پاتے۔ ہم خود سے ہی ایک طرح کی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں لگنے لگتا ہے کہ جو بھی ہم کر رہے ہیں، وہ کمتر ہے۔ ہم دوسروں کے کام جیسا کام کرنے کی کوشش کرنے لگ جاتے ہیں، اور پھر بھی وہ نہیں کر پاتے، کیونکہ حقیقت میں ہم وہ ہیں ہی نہیں۔ ہم ہم ہیں! مگر ہمارے ساتھ بچپن سے ہی ناانصافی ہوتی آتی ہے۔ پھر آپ خود بتائیں، جب بچپن سے ناانصافی دیکھی ہو، پڑھی ہو، سنی ہو، تو ہم انصاف پسند کیسے بن سکتے ہیں؟ ہم ایسے لوگ بن گئے ہیں کہ ہم انصاف سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ ہم آج ہیں، وہ مکمل طور پر ہمارا اپنا انتخاب ہے۔ ہم نے ایک آئیڈیل پرسنلٹی بنالی ہے کہ ایک شخص ایسا ہو جو بہت پیارا ہو، جس کی آواز میٹھی ہو، جس کی آنکھیں بلی جیسی ہوں، جو نرمی سے بات کرے، جو ہر بات مانے، جو ہماری ناراضگی پر ہمیں منائے، جس پر ہم غصہ کریں تو وہ معاف کر دے۔

مگر اگر ہم اس آئیڈیل انسان کو تمام انسانوں کی شخصیت پر لاگو کر کے دیکھیں، تو کوئی بھی ایسا نہیں نکلے گا۔ ہمیں چاہیے کہ جب ہم کسی انسان کو منتخب کریں، تو اسے اس کی تمام کمزوریوں کے ساتھ ہی قبول کریں، کیونکہ دنیا میں کوئی بھی مکمل پرفیکٹ نہیں ہے۔ آپ کو اپنے جیسا کوئی دوسرا انسان کبھی نہیں ملے گا۔

اس لیے مجھے لگتا ہے کہ ہمیں آج سے ہی یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ جو ہم بننا چاہتے ہیں، اسے اپنا لیں۔ لوگ آئیں گے، بکواس کریں گے، اور چلے جائیں گے۔ لوگوں کا کام ہی باتیں کرنا ہے۔

آج بھی میں اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ میں جو بننا چاہتا ہوں، وہ بن جاؤں۔ یہ مکمل طور پر ممکن نہیں، مگر جہاں تک ہم نے قابو پالیا ہے، وہاں تک تو عمل کریں۔ آگے وقت کے ساتھ، ہم اپنی اصل شخصیت کو، جو حقیقت میں ہم ہیں، سامنے لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہم سب کو یہ ساری اچھائیوں کے نام کی چیزیں سکھائی جاتی ہیں، جبکہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان کا زیادہ کام نہیں ہوتا۔ ہر چیز کو جان بوجھ کر ایک اچھائی سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مثلاً، اگر آپ کسی شخص سے پوچھیں کہ "آپ کیسے انسان ہیں؟" تو وہ فوراً اپنی اچھائیاں گنوانا شروع کر دے گا۔ اگر ہم اس کی باتوں پر یقین کر لیں، تو وہ ہمیں دنیا کا سب سے فرشتہ صفت انسان لگے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم لوگ فرشتے نہیں ہیں!

ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی گہرائیوں میں کون سی بری عادتیں اور برائیاں چھپی ہوئی ہیں، اور کوئی بھی انسان ان سے پاک نہیں ہے۔ اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے دل میں ایسی کوئی چیز نہیں، تو اسے یا تو انسان ہونے کا دعویٰ چھوڑ دینا چاہیے یا پھر جھوٹ بولنا بند کر دینا چاہیے!

انسان جب اپنی ضرورت کی چیز مکمل طور پر حاصل کر لیتا ہے، تو وہ اضافی چیزوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جس کی طرف وہ اٹریکٹ ہوتا ہے، وہ سیکس ہے۔

اگر کسی انسان سے دن بھر مزدوروں جیسا کام لیا جائے، اوپر سے مارا جائے، اور کھانے کے لیے بس ایک روٹی کا ٹکڑا دیا جائے، تو اس میں ایسی خواہشات پیدا نہیں ہوتیں۔ مگر جیسے ہی وہ سکون میں آتا ہے، تو یہ سب چیزیں ابھرنے لگتی ہیں۔

ایک بچہ، چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی، جب بلوغت کی عمر تک پہنچتا ہے، تو وہ ایک اٹریکشن محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں جنسی خواہشات پیدا ہونے لگتی ہیں، مگر چونکہ اسے ڈرا دیا جاتا ہے، اس لیے وہ کسی سے پوچھ نہیں پاتا اور غلط راستے اختیار کر لیتا ہے۔

آج معاشرے میں شادی کے بعد طلاق کی شرح بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ یہی غلط فہمیاں ہیں۔ لڑکیوں کو اس مسئلے میں کچھ حد تک سپورٹ مل جاتی ہے، مگر لڑکوں کو نہیں ملتی۔

عمومی طور پر، لڑکیوں میں جسمانی تبدیلیاں زیادہ واضح ہوتی ہیں، اس لیے زیادہ تر لوگ انہی تبدیلیوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مگر میں سب سے پہلے لڑکوں کے مسائل بیان کروں گا، کیونکہ چاہے ان کی پریشانیاں لڑکیوں سے کم یا مختلف ہوں، مگر ٹھوکر ہمیشہ چھوٹے پتھر سے لگتی ہے، پہاڑ سے نہیں!

اس موضوع پر بات کرنا میں اس لیے بھی ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ میرے دوست مجھ سے اس کے متعلق بہت زیادہ عجیب و غریب سوالات پوچھا کرتے تھے۔ اتنی زیادہ عمر میں بھی بچگانہ سوالات پوچھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں میرے سے پہلے کسی نے یہ باتیں نہیں بتائی تھیں۔

وہ میرے ساتھ کمفرٹیبل ہو کر اس موضوع پر سوالات کر لیتے تھے، اور میں اس چیز میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کیونکہ میری رہنمائی اس معاملے میں بابا نے خود کی تھی۔

باقی چیزوں کی معلومات مجھے اسپتال میں ڈاکٹرز سے حاصل ہو جاتی تھیں، کیونکہ میں اسپتال سے منسلک تھا اور وہاں گائنی وارڈ بھی موجود تھا۔ کچھ چیزیں میں نے ادھر اُدھر سے پڑھ لیں اور کچھ انٹرنیٹ سے جان لیں۔

خیر, ایک لڑکے کو 7 یا 8 سال تک کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔ ہاں، اگر اسے کوئی گالیاں نکالنا سیکھا دے تو وہ اسے نکالتا رہتا ہے- مگر اسے سمجھ نہیں ہوتی کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کے نزدیک اپنی اس اولین زندگی میں گالی کا مطلب صرف اپنے غصے کا اظہار کرنا ہے۔

میں اس اولین زندگی کے متعلق سمجھتا ہوں کہ ایک لڑکا لڑکیوں کی نسبت زیادہ خطرے میں ہوتا ہے کیونکہ یہ ہومو سیکس زیادتی صدیوں سے ایسے ہی انسانوں کی شکل میں منڈرا رہی ہے۔ بچے اپنی اس 7 سال کی عمر سے 15 سال کی عمر تک ،اسی خطرے میں سب سے زیادہ رہتے ہیں۔

اس کے بعد 22 سال کی عمر تک یہ خطرہ ضرور رہتا ہے مگر پھر اس میں سے زیادتی کا لفظ نکل جاتا ہے پھر وہ جو کر رہا ہوتا ہے اپنی مرضی سے کر رہا ہوتا ہے۔

خیر، 9 سال کی عمر کے بعد ایک لڑکے کو اس بات کا پتا چلنا شروع ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اس کے پرائیوٹ پارٹ میں عجیب طرح کی لذت آتی ہے اور وہ اپنی شکل بدلتا ہے اس سے پہلے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو نوٹ کرے۔

ہر انسان کے پاس ایک دوست ایسا ہوتا ہے جس سے وہ یہ بات شئیر کرتا ہے ایک ایسا راز دان دوست۔۔۔۔۔۔

12 سال کی عمر تک وہ دھکے کھاتا کھاتا اس بات پر پہنچ جاتا ہے کہ کوئی انٹر سیکس کا بھی سین ہوتا ہے مگر زیادہ تر کو یہ بات تب بھی پتا نہیں چلتی کہ ایسا شادی کے بعد ہونا ہوتا ہے وہ اسے ایک گندا کام ہی سمجھتا ہے۔

12 سال کے بعد اس کے پرائیویٹ پارٹ کے گرد بال آنے شروع ہوتے ہیں اور اس کو مشت زنی کا پتا چلتا ہے یہ باتیں وہ اپنے ادر گرد سے سیکھ لیتا ہے اور لڑکوں کی ایک بڑی تعداد اس عمر تک دوسرے لڑکوں کے ہاتھوں زیادتی کا نشانہ بن چکی ہوتی ہے مگر یہ کیسز بہت کم سامنے نکلتے ہیں ۔ایک اسٹیٹکس کے مطابق ہر 100 میں سے 60 لڑکے اس کا شکار ہیں چاہے وہ فعال ہوں چاہے مفعول۔

ایک بچہ چھوٹی عمر میں ہی لڑکیوں کی طرف اٹریکٹ ہونا شروع ہو جاتا ہے مگر یہ اٹریکشن صرف اور صرف دوستی تک ہوتی ہے۔ 12 سال کی عمر کے بعد ایک لڑکا چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنا شروع ہو جاتا ہے اور اپنی حوس کا شکار خود بن جاتا ہے اور وہ اپنے ہی ہاتھوں سے مزا کرنے لگ جاتا ہے۔

13 سال کی عمر کے قریب اسے پورن کی دنیا کا پتا چلتا ہے اور اسے تب یہ سمجھ آتی ہے کہ لڑکیاں کیوں ہم سے الگ ہوتی ہیں اس سے پہلے وہ بڑے بال اور میک اب کرنے والوں کو ہی لڑکیاں سمجھتا ہے 15۔ سال کی عمر کے بعد وہ لڑکیوں سے سیکس کرنے کی خواہش لے کر ابھرتا ہے پھر اسے یہ عشق محبت کا دیدار ہونا شروع ہوتا ہے اور اسے بے وفائی والی باتیں پتا چلتی ہیں اور 17 سال کی عمر میں اسے یہ باتیں مکمل سمجھ آجاتی ہیں کہ کس کام سے بچہ پیدا ہوتا ہے ؟ پھر 18 سال کا لڑکا جس نے ایسے ہی ادھر ادھر سے علم اکھٹا کیا ہوتا ہے پورن کی دنیا سے چیزیں دیکھی ہوتی ہیں وہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید جیسے ویڈیوز میں سیکس کیا جاتا ہے ویسے ہی لڑکیوں کو مزا آتا ہے اور اسے بھی۔ حالانکہ جیسے ویڈیوز کے اندر لگے ہوتے ہیں وہ انٹرنل ڈیمج کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس 18 سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد، وہ سیکس کے متعلق علم حاصل کرنا بند کر دیتا ہے اور بس مختلف چیزوں کے نام جاننے کو علم سمجھنے لگتا ہے۔ مگر حقیقت میں، اس کی 0 کاؤنسلنگ کی وجہ سے وہ اپنے اس سارے غلط علم کو ہی 100 فیصد درست سمجھنے لگتا ہے۔

اس عمر کے درمیان، وہ اپنے ہاتھوں خود کو اتنا زیادہ ضائع کر چکا ہوتا ہے کہ جس کا حساب نہیں۔ 17 سال کی عمر کے بعد تو ،خاص کر ایک لڑکا دن میں 10،10 مرتبہ مشت زنی کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے اسٹریس کو کم کرنے کا یہی طریقہ سمجھنے لگتا ہے اور تنہائی پسند ہو جاتا ہے۔

وہ سمجھتا ہے کہ اس نے بے وفائی کے بڑے بڑے غم سہے ہیں، اور ایسا کسی حد تک ہوتا بھی ہے۔ اپنی اتنی سی عمر میں ہی وہ کئی دفعہ پینک اٹیک کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے سینے میں درد محسوس کرتا ہے، مگر سب اس چیز کو مذاق بنا کر اس کی فیلنگز کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسے کبھی یہ بات پتا ہی نہیں چلتی کہ اسے کس کے پاس جانا چاہیے، کیونکہ زیادہ تر لوگوں کو پتا ہی نہیں کہ ڈاکٹر صرف دوائیوں والے ہی نہیں ہوتے۔ سائیکیٹرسٹ بھی ہوتے ہیں، جو بیہیویئر کو سٹڈی کرتے ہیں۔ سائیکیٹرسٹ صرف پاگلوں کے ڈاکٹر نہیں ہوتے۔

ان سارے معاملات کو حل کرنے کے لیے، ہمیں اپنے بچوں کو یہ تربیت دینی چاہیے کہ وہ اپنی فیلنگز کو کیسے کنٹرول کر سکتے ہیں، بجائے اس کے کہ انہیں خود اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا جائے۔

میں پھر کسی دن اس ٹاپک کو ایڈریس کروں گا اور بتاؤں گا کہ لڑکیاں کیسے اپنی بلوغت کی عمر کو پہنچتی ہیں، انہیں کیا کچھ دیکھنا پڑتا ہے، اور ان سب چیزوں کا حل کیا ہے۔

آخر میں بس اس بات پر زور دوں گا کہ ان ساری باتوں کا مقصد اپنے اندر کی آگاہی پیدا کرنا تھا، تاکہ ہم سمجھ سکیں کہ ہم نے تقریباً سب کچھ کس قدر غلط طریقے سے سیکھا ہے۔

2025/02/17

"ماضی کو بھلا کر، صلح کی راہ پر"

آج کے دن میں نے جو چیز خاص طور پر سیکھی ہے، ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ جب بھی آپ صلح کرنے لگیں، تو پچھلی ساری باتوں کو ایسے بھلا دیں جیسے وہ دن کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ جب بھی آپ صلح کے وقت پچھلی باتوں کو دہرائیں گے، تو اس سے صلح تو دور کی بات، ایک نئی قسم کی لڑائی شروع ہو جائے گی۔

آج جب میں لینگوئج سینٹر پہنچا، تو میں کسی بھی قسم کی پرانی بات کو دہرانا نہیں چاہتا تھا—وہ بات جو کچھ دن پہلے ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی، جب ایک عورت نے بلاوجہ مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ یہ سب آپ لوگوں کی غلطی ہے کہ نہ تو آپ نے مجھے جواب دینے دیا، نہ خود دیا، بس ہنستے رہے۔ اس پر وہ میری اس بات سے ناراض ہو گئے اور میری دوسری کچھ باتوں کو اور ہی طرف لے گئے، حالانکہ ان باتوں کا مقصد کچھ اور تھا۔

جیسے کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اب سے آپ لوگوں کے ساتھ دوبارہ نہیں آؤں گا، تو وہ اسے اور ہی مطلب دے بیٹھے کہ جیسے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے بھروسے بیٹھے ہیں کہ میں انہیں کھانے کے لیے لے کر جاؤں گا، تبھی وہ کھانا کھا سکتے ہیں۔ اس لیے میں اکثر کہتا ہوں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں کہ آپ میری بات کو اپنے حساب سے سمجھیں۔ اسے میرے حساب سے ہی سمجھیں گئے تو ہی بہتر ہو گا۔

خیر، سینٹر میں پھر وہی بحث شروع ہو گئی۔ وہ اور بات کریں، میں اور بات کروں۔ انہیں لگا کہ شاید میرے پاس پیسے ہی نہیں تھے اور میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اس عورت کو جواب دینا چاہیے تھا یا مجھے بولنے دینا چاہیے تھا۔ نہ وہ میری بات سننے کو تیار تھے، نہ ہی میں ان کی بات سننے کو تیار تھا۔ میں غصے سے وہاں سے اٹھ کر اپنی کلاس کے کمرے میں چلا گیا۔

خیر، سب پھر میرے پاس آ گئے۔ وہاں ایک آنٹی نے ہم میں انصاف کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ بات کیا ہے؟ میں اس معاملے پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا تھا، تو میں نے آنٹی سے ایک بات کہی:

"آپ جتنا مرضی ہم میں انصاف کرنا چاہیں، مگر ہم ایک دوسرے کی بات سے ایگری نہیں کریں گے۔ اس لیے جس مقصد کے لیے ہم انصاف کا رونا رو رہے ہیں، وہ ہے صلح۔ تو ہمیں سیدھا صلح پر آنا چاہیے، بغیر کسی بات کو دہرائے اور چپ کر کے وہ دن بھول جانا چاہیے، جیسے وہ وقت ہماری زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔"

کیونکہ جب بھی ہم صلح کے وقت پرانی باتیں دہراتے ہیں، تو جھگڑا ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جاتا ہے۔

اور دوسری بات جو میں سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی بھی اپنی کوئی برائی خود سے چھپانی نہیں چاہیے اور نہ ہی کسی دوسرے کو بتانی چاہیے۔ کیونکہ اس سے دوسرے کو موقع مل جاتا ہے، اور وہ وقت آنے پر اسی جگہ حملہ کرتا ہے، جو بات آپ کی کمزوری کے طور پر اس کے ہاتھ میں آچکی ہوتی ہے۔

میرا ایک دوست سموکنگ کرتا ہے، اور مجھے اس بات کا علم ہے۔ میں اسے منع کرتا ہوں، مگر کوئی بھی عادت آپ کسی شخص سے ایک دم ختم نہیں کروا سکتے۔ اگر آپ اسے ہر وقت یہی کہتے رہیں گے، جیسے کہ "یار! بند کر، بند کر، نہیں کرنا"، تو وہ میری بات ماننے کے بجائے مجھ سے متنفر ہو جائے گا۔ جب بھی میں اس کے سامنے آؤں گا، تو وہ مجھ سے کترائے گا اور چھپ کر سموکنگ کرے گا۔ اسی لیے میں اسے ہر وقت روکنے کے بجائے ایک توازن رکھتا ہوں — کبھی کرنے دیتا ہوں، کبھی نہیں کرنے دیتا۔ ایک خاص موقع پر اسے سمجھاتا ہوں۔ جیسے ایک مرتبہ وہ ہسپتال میں اپنے انکل کے ساتھ تھا، جن کو دل کا مسئلہ تھا۔ اس وقت اس کی مجھے کال آئی، اور مجھے پتا چلا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں کہا:

"آپ کو پتا ہے، دل کے مسائل کی ایک وجہ سموکنگ بھی ہوتی ہے۔ اور بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں، مگر سموکنگ ایک بڑی وجہ ہے۔"

اسی طرح آہستہ آہستہ وہ بہت کم ہو گیا۔ باز تو ابھی بھی نہیں آیا، مگر جیسے پہلے ہر وقت سموکنگ میں لگا ہوتا تھا، اب بہت کم ہو گیا ہے۔

اچھا، اس کا قصور بھی نہیں ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد سموکنگ ڈپریشن میں کرتی ہے۔ جب وہ سموکنگ نہیں کرتے، تو ان کا دماغ انہیں سکون نہیں لینے دیتا۔ ہر سیکنڈ ان کے دماغ میں ہزاروں سوچیں آتی ہیں، جن سے وہ بچنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے لیے ان چیزوں کے بارے میں سوچنا بھی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اسی لیے ہمیں ان پر زبردستی کرنے کے بجائے انہیں مہلت دینی چاہیے اور ان کی مدد کرنی چاہیے کہ وہ اپنے آپ سے نہ بھاگیں۔ ایک دفعہ اپنی ان سوچوں سے لڑ کر انہیں ختم کریں، کیونکہ اگر بھاگیں گے، تو بھاگتے ہی رہیں گے، اور یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا غم بن جائے گا۔

مجھے ایسا ہی ایک واقعہ یاد ہے، جو میرے ایک دوست نے مجھے بتایا تھا۔ اس کا ایک دوست تھا، جو یونیورسٹی کے بعد ان سب کے ساتھ باہر نکلا۔ اس نے سگریٹ نکالا، جلایا، منہ میں رکھا اور ایک کش لگایا۔ سامنے اس کا والد کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

جیسے ہی اس نے اپنے والد کو دیکھا، فوراً سگریٹ پھینک دیا۔ اس کے والد اس کے پاس آئے، عام باتیں کیں اور چلے گئے۔ اب وہ اس کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ پتا نہیں والد نے دیکھا ہے یا نہیں۔ سب کچھ نارمل ہی رہا، وہ خود ہی سگریٹ کم پینے لگا۔ اب ایک لمحے کے لیے سوچو، اگر اس کے والد سب کے سامنے آ کر اسے ایک تھپڑ مارتے، تو اس کو زیادہ تکلیف ہوتی کہ میری بے عزتی ہو گئی ہے۔ وہ پہلے ہی کسی دباؤ یا غم میں سموکنگ کر رہا تھا، اور اس جھٹکے سے اس کا غم مزید بڑھ جاتا۔ وہ سوچتا کہ "اب تو پتا چل ہی گیا ہے، اور بے عزتی بھی ہو گئی ہے"، تو وہ سگریٹ کم کرنے کے بجائے اور زیادہ پینا شروع کر دیتا۔ پہلے تو وہ چھپ کر سموکنگ کرتا تھا، مگر پھر وہ سرعام سموکنگ کرنے لگتا۔

ہم میں سے زیادہ تر لوگ یہی غلطی کرتے ہیں — غلط کام کر کے خود سے تو چھپاتے رہتے ہیں، مگر دوسروں کو اپنا سگا مان کر سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ حالانکہ جسے ہم سگا سمجھ رہے ہوتے ہیں، وہ اصل میں ہمارا دشمن نکلتا ہے۔

اگر میری بات پر یقین نہیں ہے، تو تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ دنیا کے سب سے بڑے دشمن پہلے بھائی بھائی ہوا کرتے تھے، ان میں دشمنی بعد میں پیدا ہوئی۔

دوسری طرف، ہم انہی باتوں کو خود کے لیے قبول نہیں کرتے۔ جیسے بہت سے لوگ مجھے بدتمیز اور خود پسند سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ہمیشہ اپنی رائے کو اہمیت دیتا ہوں۔ میں کسی زمانے تک اس بات سے انکار کرتا رہا اور اس سے منہ موڑتا رہا، مگر اب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر میں خود پسند ہوں، تو میں ہوں!

کیونکہ اگر میں نے ہی اپنی رائے کو اہمیت نہیں دینی، تو آپ آ کر میری رائے کو اہمیت کیوں دیں گے؟

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جو میری بری عادتیں ہیں، ان سے میں کیوں منہ موڑوں؟ کیوں انکار کروں کہ وہ مجھ میں نہیں ہیں؟ میں کیسے کہہ دوں کہ میں بہت اچھا ہوں؟

مجھ میں کچھ بری عادتیں ہیں، اور ان سے منہ موڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہیں ماننا چاہیے، کیونکہ میں نے آج تک کوئی ایسا باغ نہیں دیکھا جس میں کوئی ایک درخت کا پتہ خراب نہ ہو، یا کسی بھی پھول کو کانٹا نہ لگا ہو۔ اس حقیقت سے منہ موڑنے کا فائدہ نہیں ہے۔

اچھا، اس کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ کچھ ماضی ایسا ہوتا ہے جو اب بدلا نہیں جا سکتا، اور جس میں ہمیں اپنی کچھ حرکتوں کا غم رہتا ہے۔ جیسے مجھے آج بھی یاد ہے، جب میں تقریباً 6 یا 7 سال کا تھا، اپنے کچھ ہمسایہ دوستوں کے ساتھ ایک دکان پر گیا۔ واپسی پر، میں نے ایک چپس اسٹک اٹھالی کیونکہ وہ مجھے پسند آ گئی تھی۔ دکاندار کو مجھ پر شک ہوا، تو مجھے لگا کہ وہ مجھ

سے وہ واپس لے لے گا، اس لیے میں نے اسے چھپالیا۔ جب اس نے میری تلاشی لی، تو وہ چپس اسٹک مل گئی، اور اس نے مجھے ایک تھپڑ مار دیا۔ میں نے اس بات کو دل میں چھپالیا اور کئی سالوں تک اس پر شرمندہ ہوتا رہا۔

میں سمجھتا رہا کہ یہ تو چوری تھی۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ چوری نہیں تھی، مگر مجھے اس وقت پتا ہی نہیں تھا کہ چوری کیا ہوتی ہے۔ میں بالکل ویسا ہی بچہ تھا جیسے عام بچے ہوتے ہیں— جنہیں جو چیز پسند آتی ہے، وہ اٹھا لیتے ہیں، اور چھینے جانے کے ڈر سے چھپا لیتے ہیں۔

یہ میرے لیے ماضی کا ایک پچھتاوا تھا۔ مگر جب میں نے ایک دن بیٹھ کر اسے سمجھا، تو مجھے احساس ہوا کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، کیونکہ میں تب بچہ تھا۔ مجھے اس وقت کون سی اتنی عقل تھی کہ میں اچھے اور برے میں فرق کر سکتا؟ لیکن ایک لمحے کے لیے مان بھی لیا جائے کہ مجھے عقل تھی، تب بھی اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ کچھ بھی نہیں! میں ٹائم مشین میں بیٹھ کر واپس جا کر اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔

اب میں جو ہوں، میں وہ ہوں —وہ نہیں جو میں ماضی میں تھا۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ اپنے ماضی پر غم کرنے کے بجائے اپنے حال پر دھیان دوں۔

اس مقام پر، جب میں کسی کو سمجھاتا ہوں کہ آپ کو اپنے اندر کے غموں کو نکال پھینکنا چاہیے اور ان سے بھاگنے کے بجائے ایک بار ان کا سامنا کرنا چاہیے، تو وہ کہتے ہیں کہ "ان کا کوئی حل نہیں ہے، اس لیے انہیں یاد کر کے صرف تکلیف ہوتی ہے۔"

اس پر میں ان سے کہتا ہوں: "بار بار تکلیف سہنے سے بہتر ہے کہ ایک بار ہمت کر کے، ایک طرف ہو کر ساری تکلیف لے لو۔ ایمانداری سے وہ سب کچھ، جو تم نے کیا، ایک صفحے پر لکھو۔ پھر ہر بات کے ساتھ وجہ لکھو کہ تم نے وہ کیوں کی۔ کیونکہ کوئی بھی ایسا کام نہیں ہوتا جس کی کوئی وجہ نہ ہو، چاہے وہ خواہش میں کیا گیا ہو یا محض دل کے کہنے پر۔"

پھر، ہر سوال کا جواب دو۔ خود سے پوچھو: "اگر میں اس کا جواب نہ دوں، تو کیا مجھے سزائے موت ملے گی؟" اس مشق سے تمہیں اپنے اعمال کی حقیقت سمجھ آئے گی۔

اس کے بعد، اس کاغذ کو جلا دو اور اپنے غم سے آزاد ہو جاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اگر کوئی کام تم نے کسی بری عادت کے تحت کیا ہے، تو اسے قبول کر لو۔ مان لو کہ یہ بری عادت تم میں موجود ہے۔ ہاں، میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی برائیاں ہر کسی کے سامنے بیان کرنا شروع کر دو، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر تم نے کوئی برا کام کیا ہے اور کسی نے تمہیں نہیں دیکھا، تو اسے اپنے پاس رکھو۔ عدالت میں جا کر سب کے سامنے بولنے کی ضرورت نہیں۔ بس اسے خود قبول کر لو اور اگر وہ واقعی غلط ہے، تو اسے ٹھیک کر لو۔

کیونکہ بعض عادتیں دوسروں کے لیے غلط ہوتی ہیں، مگر ہم انہیں درست سمجھتے ہیں۔ جیسے، میں خود پسند ہوں۔ میں اپنے آپ کو اول درجہ دیتا ہوں، کیونکہ میں ایسا ہی ہوں۔ اور میں اسے غلط نہیں سمجھتا۔

کچھ لوگوں کو لگتا ہے کہ میں اپنے فیصلے زبردستی دوسروں پر تھوپتا ہوں، مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اگر انہیں ایسا لگتا ہے، تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں، کیونکہ وہ کون سا میرا فیصلہ دل سے مان گئے ہیں؟ اگر مان گئے ہوتے، تو یہ بات نہ کہتے۔ اگر کہہ رہے ہیں، تو پھر ایسا ہو نہیں رہا، کیونکہ کوئی بھی شخص زبردستی تھوپا گیا فیصلہ قبول کر کے اس پر عمل نہیں کرتا۔

کچھ لوگوں کو یہ بھی لگتا ہے کہ میں جو بھی ان سے کروانا چاہتا ہوں، وہ کروا لیتا ہوں، مگر جب ان کی باری آتی ہے، تو میں ایسا نہیں کرنے دیتا اور بہانے بنانے لگ جاتا ہوں۔ تو میں ان سے کہتا ہوں: "اگر تمہیں ایسا لگتا ہے، تو جیسے میں کر رہا ہوں، ویسے تم بھی کرو! مت مانو میری بات، جیسے میں نہیں مان رہا۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔"

اور میں نے نہیں دیکھا کہ اس طریقے سے کوئی چیز بدلی ہو، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو کوئی بڑی تبدیلی ضرور آتی۔ لوگ آتے ہیں، آپ کے گلے میں ایک "ٹیگ" ڈال کر چلے جاتے ہیں، مگر میں کیا کرتا ہوں؟ میں اس ٹیگ کا حل بتا دیتا ہوں۔ اگر تمہیں یہ پسند نہیں، تو تم بھی ایسا ہی کرو۔

پھر کچھ "چول" کہتے ہیں: "اگر ہم نے ایسا کیا، تو تم پچھتاؤ گے!"

تو میرے بھائی، پچھتانا میں نے ہے! تم وہ کرو جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے۔ میں پچھتا لوں گا!

ایسا عجیب قسمت کا مالک میں ہی اس دنیا میں نہیں ہوں، تقریباً سب ہی اسی الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہم نے خود ہی ایک دوسرے کو پھنسا کر رکھا ہے۔ اس لیے نہ تو دوسروں کے لیے ایسا کریں اور نہ کسی کو اپنے ساتھ ایسا کرنے دیں۔

ایک اور بہت ضروری بات، جو شاید اس سے تھوڑی الگ ہو، مگر میرے ذہن میں آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ہمیں کبھی بھی "قربانی" کے نام پر ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ دوسروں کو خوش کرنے کے لیے اپنی یا اپنے خاندان کی ضروریات کو نظر انداز کر دیں۔

یہ دکھانے کے لیے کہ ہم "بڑے اچھے" ہیں، اگر ہم دوسروں کو اپنے یا اپنے بچوں، بہن بھائیوں کے حصے کا نوالہ کھلانا شروع کر دیں گئے، تو یہ صحیح نہیں۔ جیسے آج کل ایک عام رواج ہے کہ اگر گھر میں مہمان آئیں، تو کئی اقسام کے کھانے تیار کیے جاتے ہیں، مگر ان میں سے بچوں کو کھانے نہیں دیا جاتا۔ انہیں کہا جاتا ہے کہ "پہلے مہمان، پھر تم!"

میری دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ پہلے اپنوں کو تو دو، پھر جو بعد میں آئیں، انہیں بعد میں دیکھا جائے گا۔

اپنا حصہ کسی دوسرے کو دینا اچھی بات ہے، مگر اگر ایسا کرنے سے اپنے ہی متنفر ہو جائیں یا مفلس ہو جائیں، تو یہ نیکی کے بجائے ایک "بھیانک عمل" بن جاتا ہے۔

اسی لیے مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی ایک بے کار رواج ہے، اور ہمیں ہر اس چیز سے آگے بڑھنا چاہیے، جو واقعی اہم نہیں ہے۔

2025/02/18

"جینا تو ابھی بھی باقی ہے"

ایک انسان کبھی کبھی ایسی جگہ آ کھڑا ہوتا ہے جہاں وہ مکمل طور پر خود کو خالی سمجھنے لگتا ہے۔ اسے لگنے لگتا ہے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ مجھے بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں، اور ایسا ہوتا بھی ہے، کیونکہ جب آپ کو ہر طرف اندھیرا ہی نظر آئے گا تو آپ یہی کہیں گے کہ ہر طرف اندھیرا ہے۔ یہ تو کوئی پاگل ہی ہوگا جو انکار کرے۔ مگر آج میں نے یہی چیز سیکھی ہے کہ شاید اگر ہم غور کریں تو ہمارے پاس سب کچھ ختم نہیں ہوتا۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک سو روپے ہوں اور 99 گم ہو جائیں، تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کے پاس سب ختم ہو گیا، مگر وہ بھول جاتا ہے کہ نہیں، ابھی سب نہیں ہوا، ایک روپیہ اب بھی باقی ہے۔ ہاں، اگر اس کے نظریے سے دیکھیں تو 100 میں سے واقعی زیادہ تر اجڑ گیا، مگر زندگی زیادتی پر منحصر نہیں کرتی۔

زندگی جینے کے لیے جسم کو ایک مخصوص مقدار میں توانائی چاہیے، اور جسم کو ڈھانپنے کے لیے ایک مخصوص مقدار میں کپڑے درکار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی آتا ہے، وہ اضافی ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ واقعی جب ہمارے پاس چیزوں کی فراوانی ہو، تو ہمیں اسے انجوائے کرنا چاہیے۔ دوسروں میں بانٹنا اچھی بات ہے، بہت اچھی بات، مگر اگر آپ سب کچھ بانٹ بھی دیں گے، تب بھی دنیا کی بھوک نہیں مٹا پائیں گے۔

ہم میں سے بعض لوگوں کو یہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ایک کی مدد تو کر دی مگر دوسرے کی نہیں کر سکے۔ مگر شاید، میں سمجھتا ہوں کہ جتنا ہم کر سکتے تھے، وہی کیا۔ اگر ہم سب کچھ لگا دیں گے تو خود مفلس ہو جائیں گے، اور یہ کوئی

سمجھداری کا کام نہیں ہے۔ ہم میں سے کئی لوگ کسی بھی چیز کے لیے کسی کو "نہ" نہیں کہہ پاتے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں کر سکیں گے، جو واقعی غلط ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ جو کام ہم کر سکتے ہیں، اس پر ہاں کہیں اور جو نہیں کر سکتے، اس پر معذرت کر لیں، کیونکہ ہاں کہہ کر بھی اگر نہیں کر پائیں، تو یہ کسی کے لیے بھی فائدہ مند نہیں ہو گا۔ میرا ایک دوست کہتا ہے کہ اگر ہم "نہ" کہیں گے، تو اگلا بندہ ناراض ہو جائے گا۔ مگر اگر وہ صرف آپ کے "نہ" کہنے پر ناراض ہو جائے، تو پھر آگے اللہ ہی حافظ ہے!

باقی باتوں کا بھلا، وہ شخص آپ کا خیر خواہ کیسے ہو سکتا ہے جو آپ کی مجبوری کو سمجھنے سے بھی قاصر ہو؟ ایسے بندے سے وقت ضائع کرنے کے بجائے تعلق ختم کر دینا چاہیے۔ یہاں ایک اور بات، لوگ تعلق ختم کرنے سے بھی بہت ڈرتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں سے کہتا ہوں کہ ڈر ڈر کر، تکلیف اٹھا اٹھا کر تعلق رکھنے سے بہتر ہے کہ معذرت کر کے ختم کر لیں۔ اگلے بندے سے کہیں:

"میرے بھائی! میری کچھ حدود ہیں، اور میں انہیں کسی کو عبور کرنے نہیں دیتا۔ اگر آپ کو کوئی مسئلہ ہے، تو آپ نہ بلائیں، میں کسی پر زبردستی نہیں کرتا۔"

ایسا کرنا بہت مشکل ہے، مگر یاد رکھیں، آسان کام تو سبھی کر لیتے ہیں۔ اگر ہم ساری عمر آسان کام ہی کرتے رہے، تو زندگی کے آخر میں بھی وہیں کھڑے ہوں گے، جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔

اسی لیے، مشکل کاموں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ میں کسی زمانے میں لوگوں کے سامنے بات کرنے سے بہت ڈرتا تھا۔ مجھے یہ کام بے حد مشکل لگتا تھا۔ جب بھی میں لوگوں کے سامنے بات کرنے جاتا تھا، میری آواز لرزنے لگتی تھی، اور ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے، جب پہلی بار میں اپنی کلاس میں دوستوں کے سامنے ایک ٹاپک سمجھانے کے لیے وائٹ بورڈ کے سامنے کھڑا ہوا تو ایک لمحے کے لیے خوفزدہ ہو گیا۔ کلاس میں تقریباً 60 بچے تھے، جن میں سے 25 کے قریب میرے قریبی دوست تھے، مگر ان کے سامنے بھی میں ڈر گیا۔ اوپر سے میری کلاس کی لڑکیوں کو تو شاید مجھ سے ذاتی دشمنی تھی۔ وہ میری حالت دیکھنے کے باوجود عجیب نظروں سے مجھے گھورنے لگیں، اوپر سے میرے کلاس ٹیچر نے بھی پیچھے جا کر میری ویڈیو بنانی شروع کر دی۔

لوگوں کو کیمرے کا ایک الگ ہی خوف ہوتا ہے، اور میں تو مکمل طور پر ڈر گیا! مگر کسی نہ کسی طرح میں نے 10 منٹ میں ٹاپک سمجھا دیا۔ میری لکھائی بہت اچھی تھی، مگر وائٹ بورڈ پر "کیڑے" ہی مار آیا! بعد میں میرے دوستوں نے کہا:

"بھائی! تم تو بالکل ہی گھبرا گئے تھے!"

میں نے کہا: "تم لوگ ذرا وہاں جا کر نظارہ کر لو، پھر دیکھنا مجھے کیسا لگا تھا!"

اب ہوا یہ کہ میں گھر آیا، تو میرے ٹیچر نے میری ویڈیو میرے والد کو بھیج دی تھی۔ بعد میں وہ ویڈیو مجھ سے کہیں گم ہو گئی، مگر میرے والد نے میری بہت تعریف کی اور والدہ سے کہا:

"دیکھو، اتنے سارے بچوں کو پڑھا رہا ہے!"

یہ سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ اگلے دن میں نے اپنے ٹیچر سے کہا کہ مجھے دوبارہ پڑھانا ہے، اور انہوں نے اجازت دے دی۔ اس بار بھی ڈر تو لگا، مگر اس بار مجھے مزہ بھی آیا۔ میں نے اپنی لکھائی بھی بہتر رکھنے کی کوشش کی، مگر ایک دن میں بھلا کتنا فرق پڑتا؟ ہر چیز وقت لیتی ہے۔

آہستہ آہستہ، یہ چیزیں مجھے اتنی مزے کی لگنے لگیں کہ اب بڑے بڑے پروفیسر بھی اس بات پر متفق ہیں کہ:

"معیز کا پڑھانے کا انداز اور اپنی بات سمجھانے کا فن بے حد کمال کا ہے وہ اپنی بات کو بہترین انداز میں بیان کر لیتا ہے!"

ہاں، کچھ لوگ آج بھی تنقید کرتے ہیں، مگر اب مجھے ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، میں اب بھی کبھی کبھی بڑے بڑے بلنڈرز کر دیتا ہوں، مگر میں نے یہ سیکھا ہے کہ بلنڈرز یہ فیصلہ نہیں کرتے کہ آپ نکمے ہیں۔

اگر ہم اپنی مشکل اور ڈر کو مزے میں بدل لیں تو وہی چیز ہمارے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ ہمیں بالکل نارمل لگنے لگتی ہے۔ لوگوں کا کام ہے ڈرانا اور مشکلات پیدا کرنا، آپ انہیں کبھی ختم نہیں کر سکتے، مگر آپ خود کو قابو میں کر سکتے ہیں، اپنے آپ کو تیار کر سکتے ہیں۔

اگر آپ ڈریں گے، تو لوگ آپ کو مزید ڈرائیں گے۔ وہ آپ کے ڈر کا فائدہ اٹھائیں گے۔ جیسے ایک کتا، اگر وہ آپ کے پیچھے پڑ جائے اور آپ بھاگنا شروع کر دیں، تو وہ آپ کے ڈر کا فائدہ اٹھائے گا اور آپ کو بھگاتا رہے گا۔ مگر اگر آپ ایک بار مڑ کر اسے پتھر مار کر ڈرا دیں، تو وہ باز آ جائے گا۔

ایسا ایک بار میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ جب میں چھوٹا تھا، تو خراب حالات کی وجہ سے گھر والے مجھے گھر سے زیادہ دور نہیں جانے دیتے تھے۔ کچھ گلیوں میں جانے پر تو مکمل پابندی تھی، اور اگر ہم وہاں جاتے تو سزا ملتی تھی۔

میرے بڑے بھائی کے دوستوں کو پتا تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہے، تو جب حالات ٹھیک بھی ہو گئے اور میں ان گلیوں میں جانے لگا، اور وہ مجھے دیکھ لیتے، تو کہتے:

"ہم تمہارے گھر بتائیں گے، اور تمہیں سزا ملے گی!"

میں اس چیز سے ڈر جاتا تھا کہ اگر یہ میرے گھر بتا دیں گے، تو مجھے سزا ملے گی۔ میں تو ان کے پاؤں پڑ جاتا کہ:

"نہیں، تم میرے گھر نہ بتانا!"

ان کو مجھے تنگ کرنے میں مزا آتا تھا، اور وہ باز نہیں آتے تھے۔ وہ ہر وقت اسی تاڑ میں رہتے کہ مجھ سے ترلے کروائیں۔

مجھے تو ایسے لگنے لگا جیسے مجھے ہر جگہ کھڑا ہونے سے ڈر لگنے لگا ہو۔ جہاں بھی وہ ملتے، میں تو وہ گلی ہی بدل لیتا جہاں میں انہیں دیکھ لیتا۔ مگر ایک دن میں نے ترلے کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

"جاؤ، بتادو! جو ہو گا، دیکھا جائے گا!"

وہ بھی باز نہ آیا۔ اس نے میرے گھر بتادیا۔ مجھے ایک دفعہ سزا تو مل گئی، مگر پھر میں اکڑ گیا۔ اس کے بعد جب بھی وہ مجھے کہتا، میں اسے یہی کہتا:

"جا، جا کے بتادے!"

اس طرح وہ باز آ گیا۔ اسے لگنے لگا کہ شاید اب اس کا یہ ڈر ختم ہو گیا ہے، جو واقعی میں نے ختم کر لیا تھا۔

بعد میں ہم وہاں سے چھوڑ کر لاہور موٹروے سٹی آ گئے۔ اب جب بھی میں بیگم کوٹ جا کر ان گلیوں میں جاتا ہوں، تو مجھے وہ بات یاد آتی ہے۔ اور مجھے ان گلیوں کی بو سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جب ہم ڈرتے ہیں، تو دنیا ہمیں اور ڈراتی ہے۔

اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے کوئی الٹا کام بھی کر دیا ہے، تو دنیا سے نہ ڈریں، چاہے کسی نے دیکھ بھی لیا ہو۔ جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہی ہو جائے گا؟ مار پڑے گی، اور اس سے بھی زیادہ کیا ہو گا؟

دنیا میں کوئی جتنا مرضی طاقتور ہو، ہمیشہ تک تو زندہ نہیں رہے گا۔ وہ بھی ویسے ہی مرے گا، جیسے سب نے مرنا ہے۔ اسی لیے، مجھے مظلوم کے مرنے کا دکھ تو ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی خوشی بھی ہوتی ہے کہ ظالم بھی کون سا زندہ رہے گا!

موت ایک ایسی چیز ہے کہ انسان جہاں مرضی چلا جائے، وہ اسے وہاں بھی آ کر رہے گی۔ موت کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔

خیر، ایک اور چیز۔ کچھ لوگ آپ کی زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جو شروع میں تو بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر بعد میں آپ کے ساتھ خراب ہو جاتے ہیں۔

اس کی ایک وجہ کچھ لوگوں کا رویہ (بیہیوئیر) ہے۔ وہ جو باتیں انہیں بری لگتی ہیں، شروع میں باہر سے تو انہیں نظر انداز (اگنور) کرتے رہتے ہیں، مگر چونکہ وہ ان باتوں کے خلاف ہوتے ہیں، اس لیے وہ آہستہ آہستہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہر بار ہی ہوتا ہے۔ اس طرح وہ دل میں متنفر ہونے لگ جاتے ہیں۔

پھر یہی نفرت بڑھتی رہتی ہے اور کبھی کبھی جلوہ بھی دکھاتی ہے۔ مگر چونکہ تب تک بندہ بہت حد تک کھل مل چکا ہوتا ہے، تو وہ کوئی بھی بات اتنی سنجیدہ (سیریس) نہیں لیتا۔ وہ پھر زیادہ مخالفت کرنا شروع کر دیتا ہے، اور یوں، آپ کے باز آنے کے باوجود، وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ ایسا ہی دوبارہ بھی کرے گا، چاہے زبان سے انکار کرے!

وہ متنفر ہو جاتا ہے اور الگ ہونا شروع کر دیتا ہے۔ اور یوں، وہ برا بھی لگنے لگتا ہے، کیونکہ یہ حرکت واقعی بری بھی ہے۔ ایک وقت اچھا گزار کر بعد میں برائی کرنا مناسب نہیں۔

اس کی ایک اور وجہ دوسرا رویہ (بیہیوئیر) ہے کہ بندہ اپنے مزاج کے خلاف بات پر لڑنے لگ جائے۔ اس سے تو سیدھی سیدھی لڑائی ہو جاتی ہے اور تعلق برباد ہو جاتا ہے۔

ایک تعلق عزت کے ساتھ ختم کرنا ہوتا ہے، جہاں بندہ کہے:

"میں یہ مانتا ہوں، آپ وہ مانتے ہیں، اس لیے ہم لڑنے کے بجائے الگ ہو جائیں!"

اور ایک تعلق بربادی کے ساتھ ختم کرنا ہوتا ہے، جہاں بندہ اپنا بھی نقصان کرواتا ہے اور دوسرے کا بھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب رشتے "سنبھالنے" کی نوبت آ جائے، تو سمجھ جاؤ کہ وہ ختم ہونے والے ہیں۔

ایک اور چیز، میرا ایک دوست مجھے آج کہہ رہا تھا کہ "تم اپنی غلطی نہیں مانتے۔ جب بھی تمہیں کہا جائے، تم اس پر باتیں بنا لیتے ہو اور غلطی قبول نہیں کرتے!"

میں نے کہا: "جب میں اس چیز کو غلط مانتا ہی نہیں، تو کیسے کہہ دوں کہ میں نے غلطی کی ہے؟ کیونکہ جو چیز تم کہہ رہے ہو، وہ تمہارے نزدیک غلط ہے!"

ہوا کچھ یوں تھا کہ ہم آج کھانے کے لیے گئے تھے۔ اس نے مجھے کہا:

"میں نے کھانے کے بعد کہیں جانا ہے، تو اگر میرے بابا کی کال آئے، تو کہہ دینا کہ میں تمہارے ساتھ سے ابھی ابھی نکلا ہوں جب تم اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔"

میری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے بابا کی کال نہ ہی اٹھاؤں، کیونکہ جب بھی میں ان سے بات کرتا ہوں، کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے۔

خیر، اس کے بابا کی کال مجھے آ رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنے دوست کو کال کی اور اسے بتایا۔ اس نے کہا:

"آپ بابا کو کال کر کے کہو کہ ابھی ابھی نکلا ہے!"

اس کے علاوہ کوئی بات مجھے ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی، کیونکہ کال میں آواز کٹ کٹ کر آ رہی تھی۔ بس ایک اور بات سمجھ آئی کہ اس نے کہا:

"میں نے آپ کو میسج کیا ہے، وہ دیکھو!"

میں نے فوراً کال کاٹ کر میسج دیکھا، مگر کوئی میسج آیا ہی نہیں تھا۔

پانچ منٹ بعد اس کے بابا کی دوبارہ کال آ گئی۔ ہماری نارمل بات ہوئی۔ انہوں نے کہا:

"وہ میرا دوست کہاں ہے؟"

میں نے کہا: "وہ ابھی ابھی نکلا ہے!"

انہوں نے پوچھا: "کیوں؟"

میں نے کہا: "ہم کھانا کھا رہے تھے، اس لیے!"

انہوں نے کہا: "اوکے اوکے!" اور بات ختم ہو گئی۔

اس کے بعد میرے دوست کا میسج آیا:

"کھانے کا نہ بتانا!"

میں نے فوراً اسے کال کی اور کہا:

"اب میسج کر رہے ہو؟ میں نے کھانے کا بتا دیا ہے!"

اس نے کہا: "کیوں بتایا؟"

میں نے کہا: "اب کہہ رہے ہو؟"

اس نے کہا: "میں نے وہاں سے چلنے سے پہلے بتایا تھا!"

قسم سے! مجھے بالکل یاد نہیں کہ ایسا بھی اس نے کچھ کہا تھا! وہاں تو زیادہ تر یہی بات ہوئی تھی کہ میں کال ہی نہ اٹھاؤں!

وہ کہتا ہے کہ "اپنی غلطی مانو!"

میں نے کہا: "میں اسے غلطی سمجھتا ہی نہیں! اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں نے بہت بڑا بلنڈر کیا ہے، تو ٹھیک ہے، مگر میں اسے غلطی نہیں مانتا!"

وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک تھا، کیونکہ بعد میں اس کے ساتھ کیا ہونا ہے، وہ صرف وہی جانتا ہے، میں نہیں! اس لیے شاید وہ زیادہ اوورری ایکٹ کر گیا۔

خیر، اب کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ میں سمجھ سکتا ہوں!

مجھے اس بات سے بھی بڑی نفرت ہے جب کوئی میری بات کو اس لیے اہمیت نہیں دیتا کہ وہ میری عمر سے میری بات کا اندازہ لگا رہا ہوتا ہے۔

میں عمر کو صرف ایک نمبر سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں! بالوں کے رنگ بدلنے کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے ایسے ایسے بابے بھی دیکھے ہیں کہ لوگ ان کو بے وقوف کہتے ہیں، ان کی اپنی نسل ہی ان کو بے وقوف سمجھتی ہے۔

اگر عمر کا واقعی بات کی اہمیت سے کوئی تعلق ہوتا، تو کوئی بھی بڑی عمر کا بندہ بلنڈر نہ کرتا! میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک کو اپنی بات رکھنے کا موقع ملنا چاہیے، مگر انسان میں صبر ہی کہاں ہے؟

اچھا، یہ بات اکثر لوگ مجھے بھی کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں بات کاٹ دیتا ہوں اور صبر نہیں کرتا!

میں ایک سوال کا ایک ایک کر کے جواب دینا پسند کرتا ہوں۔ سو سوال اکٹھے پوچھ کر جواب کون دے سکتا ہے؟

ایک ایک کر کے سوال کرو اور جواب لیتے جاؤ!

بے جا لڑائی ڈال رکھی ہوتی ہے! اور ہوتی بھی کیوں ہے؟

آخر میں بات ختم کرنے کے لیے تو سیدھا اس پر آؤ!

یا تو بات کو بڑھاؤ ہی نہیں!

اس پر کوئی نہیں آئے گا، اور عجیب عجیب چیزیں کرتے پھریں گے! اب ان کو کون سمجھائے الزام پر صبر اور ہے اور دوسری چیزوں پر صبر اور۔

2025/02/19

"روٹی کھل گئی اے!"

آج کا دن میرے ان چند دنوں میں سے تھا جنہیں میں بہت زیادہ انجوائے کرتا ہوں۔ اتنا زیادہ انجوائے کرنے کے ساتھ ساتھ، میں بہت کچھ سیکھ بھی لیتا ہوں۔ اصل میں ہم لوگ صرف کتابوں کی باتوں کو پڑھنا ہی سیکھنا سمجھتے ہیں، مگر شاید وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں جو واقعی ہمارے لیے بہت اہم اور ضروری ہوتا ہے۔

آج کے دن مجھے ڈاکٹر فیضان اور وقار بھائی کے ساتھ جانا تھا۔ مجھے پہلے سے اس بات کا علم تھا کیونکہ ڈاکٹر فیضان کی ایک دوست ہنگری سے آرہی تھی۔ وہ پہلے بھی ایک دفعہ پاکستان آئی تھی، مگر میرے پاس تب وقت نہیں تھا، اس لیے میں اس سے ملنے نہیں جا سکا۔ اس کا نام اور وہ کس ملک سے تھی، یہ مجھے پہلے سے معلوم نہیں تھا۔ بس اسے تصویر میں دیکھا تھا اور اتنا ہی پتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی دوست ہے۔

مجھے وقار بھائی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بدھ والے دن ہم نے جانا ہے، تو آپ نے بھی ضرور آنا ہے۔ خیر، کل رات مجھے بہت زیادہ کام کرنا تھا، اس لیے رات کے تین بج گئے۔ اوپر سے نیند ہی نہ آئی۔ اللہ اللہ کر کے رات چار بجے نیند آئی اور پھر بہت سکون کی آئی۔ میں نے صبح چھ بجے کا الارم لگا کر رکھا تھا، کیونکہ وقار بھائی نے کہا تھا کہ آٹھ بجے تک ہمارے پاس پہنچ جانا، اس لیے مجھے سات بجے تک گھر سے نکلنا تھا۔

میں نے چھ بجے الارم بند کیا تو سوچا کہ کوئی آدھا گھنٹہ اور سو لیتا ہوں، کیونکہ نیند تو مجھے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے ابھی آنکھ بند کی ہی تھی کہ جیسے پلک جھپکنے کی دیر تھی، دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ آٹھ بج گئے! میں نے کہا، "لو جی، دیر ہو گئی!" فوراً اٹھ کر موبائل دیکھا تو وقار بھائی کی تین کالز آ چکی تھیں۔ میں نے انہیں کال کی تو انہوں نے کہا، "یار، آپ ہسپتال آ جاؤ، ہم وہاں ہیں، پھر نکلتے ہیں۔"

میں جلدی سے تیار ہو کر ہسپتال پہنچا۔ اس وقت وہ لوگ ایم ایس کے پاس بیٹھے تھے۔ ایم ایس ایک خاتون تھیں۔ ہسپتال میں ہی میں نے پہلی بار ڈاکٹر فیضان کی دوست کو دیکھا۔ میں اور وقار بھائی ساتھ والے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ پھر جب ڈاکٹر فیضان اور ان کی دوست آئی تو ہماری پہلی بار آپس میں بات ہوئی۔

جب وہ آئی تو اس نے مجھ سے سلام لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ سمجھ گئی اور کہنے لگی، "اگر آپ ہاتھ نہیں ملانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ اصل میں ہمارے کلچر میں یہ ایک عام بات ہے، مگر میں جانتی ہوں کہ آپ لوگ ایسا نہیں کرتے۔" میں نے بھی یہی کہا کہ ہم لوگ عورتوں سے ہاتھ جلدی نہیں ملاتے۔

وہاں ہسپتال کے بہت سے لوگ اس سے ملنے آئے۔ اچھا، ایک بڑی مزے دار بات بتاتا ہوں کہ عام طور پر یہاں لوگ جب کسی غیر ملکی کو دیکھتے ہیں تو شاید انہیں دیکھ کر پاگل ہو جاتے ہیں اور عجیب عجیب سوال کرنے لگتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ کوئی برے لوگ ہوتے ہیں، بلکہ وہ تو اپنی طرف سے محبت کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں، مگر شاید انہیں یہ نہیں سمجھ آتا کہ محبت کا اظہار کیسے کرنا ہے۔

ڈاکٹر فیضان کی دوست نے اپنا تعارف کروایا کہ اس کا نام "ٹنڈے" ہے۔ یہ نام سن کر میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنس پڑی اور کہنے لگی، "میں جانتی ہوں کہ آپ کی زبان میں اس کا مطلب مزاحیہ ہے۔" وقار کے والد صبح اسے کہہ رہے تھے، "بیٹی، اپنا نام بدل لو!" میں نے اس سے پوچھا، "آپ کہاں سے ہیں؟" اس نے جواب دیا، "میں ہنگری سے ہوں۔" وہ ہم سے انگریزی میں ہی بات کر رہی تھی۔ اردو تو اسے آتی نہیں تھی، مگر وہ اردو سیکھنے کا بہت شوق رکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے نام کا مطلب ہنگری کی زبان میں "پری" ہے۔

ہسپتال سے ہم چاروں نکلے اور ہمارا پلان سیدھا اندرون لاہور جانے کا تھا۔ ہم ایک ایسی بیٹھک میں گئے جو لاہور کی ایک مشہور پتلی سی گلی (نکاح گلی) کے سامنے تھی۔ اس گلی کے بارے میں مشہور ہے کہ اگر ایک طرف سے لڑکا اور دوسری

طرف سے لڑکی آ رہی ہو تو درمیان میں نکاح کی گنجائش بچتی ہے۔ ہم بعد میں اس گلی کی طرف گئے تو وہاں دو بوڑھے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا، "یہ وہی گلی ہے نا؟" تو وہ کہنے لگے، "ہاں، یہی ہے، مگر ادھر نکاح کوئی نہیں ہوتا، یہ جھوٹ ہے!"

مجھے اندر ہی اندر بہت ہنسی آئی، جیسے ہمیں تو یہ پہلے سے پتا ہی نہیں تھا! ہمیں پتا تھا، بس یہ جملہ گلی کی مشہوری کی وجہ سے کہا جاتا ہے، جیسے انگریزی میں کسی الٹے کام پر کہتے ہیں "Oh, shit!" اب اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ بندہ کہہ رہا ہو کہ مجھے واش روم جانا ہے!

اندرون لاہور جانا میرے لیے بھی پہلا تجربہ تھا، کیونکہ میں پہلے کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ وہاں بیٹھک میں پرانے زمانے کا سامان دیکھ کر بہت مزہ آیا۔ ایسی چیزیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ کچھ بہت پرانی تہذیبوں کی چیزیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ دیکھو، دنیا کتنی تیزی سے آگے بڑھ گئی ہے۔ آج سے سو سال پہلے یہ سارا سامان کسی کے لیے "سپر کمپیوٹر" جیسا تھا، اور آج ہمارے ہاتھ میں تیز ترین ڈیوائسز موجود ہیں۔

ایک اور بات میرے ذہن میں آئی۔ آج سے سو سال پہلے یہ چیزیں جن لوگوں کی ملکیت تھیں، وہ اکڑ کر چلتے تھے کہ ہمارے پاس بہت قیمتی چیزیں ہیں۔ کسی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتے تھے۔ ہمارے بڑے بتاتے ہیں کہ پرانے زمانے میں سردار لوگ سامان کو ہاتھ لگانے پر بھی مار دیا کرتے تھے۔ مگر آج وہ لوگ کہاں ہیں؟ کسی کو ان کا پتا بھی نہیں، وہ کہاں دفن ہیں، کوئی نہیں جانتا۔

اسی لیے میں ہمیشہ ان لوگوں کو بے وقوف سمجھتا ہوں جو چیزوں سے انسان کی حیثیت کا فیصلہ کرتے ہیں۔

بہر حال، وہاں ان کی پرانی طرز کی چائے سرو کرنے کا طریقہ اور بند کے اندر مکھن بہت لذیذ تھا۔ ہم نے وہاں خوب تصویریں بھی اتاریں — کبھی کسی کی، کبھی کسی کی۔ کبھی ایک کو کہہ دیا، "تم لو"، تو کبھی دوسرے کو۔

اس کے بعد ہم چھت پر گئے، جہاں کچھ پرانے انسٹرومنٹ رکھے تھے۔ ہم نے انہیں بجانا شروع کر دیا، حالانکہ ہم لوگ بہت خراب میوزک بجانے والے تھے، اور کیسا ہی بجا سکتے تھے! اوپر سے وہ انسٹرومنٹ پہلے ہی پرانے اور خراب تھے، کچھ تو ٹوٹے ہوئے بھی تھے، مگر چلو کوئی بات نہیں۔ ہم نے وہاں بھی تصویریں لیں اور پھر بیٹھک سے نکل آئے۔

بیٹھک والا دراصل ہمارا اپنا ہی بندہ تھا، دوست تھا، اور ہمارے ہسپتال میں بھی کام کر چکا تھا۔ اس لیے یہ سب کچھ اس کی طرف سے ہی ہوا —یعنی بلکل فری! ہاہاہا!

اس کے بعد ہم اس پتلی والی گلی کی طرف گئے، جہاں وہی انکل بیٹھے تھے جو کہہ رہے تھے کہ شادی والی بات جھوٹ ہے۔ وہاں کچھ دیر رکنے اور مزید تصویریں لینے کے بعد ہم بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے، اور آخر کار مسجد وزیر خان پہنچے۔ وہاں میں نے کچھ لڑکوں کو دیکھا جو شاید سکول سے بنک (چھٹی) کر کے آئے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی کچھ لڑکیاں بیٹھی آرٹ کا کام کر رہی تھیں۔

خیر، اس کے بعد ہم وہاں سے نکلے اور ہمیں ہائیکی پر جانا تھا۔ ہم نیشات پہنچے۔ ایک بات ماننی پڑے گی کہ نیشات اندر سے واقعی بہت خوبصورت ہے۔ ہم اس ہال میں پہنچے جہاں مختلف شہروں کے ہسپتالوں کے ڈاکٹرز کو بلایا گیا تھا، اور ہر ہسپتال سے ایک ڈاکٹر نے آکر فنگل رائینو سینو سائٹس پر 6 منٹ تک بولنا تھا۔ ہمارے ہسپتال سے ایک لیڈی ڈاکٹر (ڈاکٹر امبر) نے بولنا تھا، جو ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر بیٹھ چکی تھیں وہ واقعی بہت اچھی تھیں میں پہلی دفعہ ہی ان سے بھی ملا مگر مجھے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں لگا کہ ہم پہلی دفعہ مل رہے ہیں ہم تو آپس میں ایسے مذاق کر رہے تھے جیسے ہمارا پتا نہیں کتنا پرانا تعلق ہے۔

وہاں حال میں شروع شروع میں سب کچھ بہت اچھا لگا، مگر بعد میں سب ہسپتال والوں کے ڈاکٹرز نے پہنچنے میں بہت دیر کر دی۔ وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دیر سے آنے والا کوئی بڑا بندہ لگتا ہے، حالانکہ عزت ان کی اپنے گھر میں اتنی سی ہوتی ہے کہ دوسری بار سالن مانگنے پر گھر والے بھی کہہ دیتے ہیں: "آپ کون؟"

ایک تو وہ دیر سے آئے، اوپر سے اتنے سارے ہسپتالوں کے ڈاکٹرز نے باری باری بولنا شروع کیا۔ مجھے تو کچھ خاص سمجھ نہیں آئی، کیونکہ ہر کوئی آ کر سیدھا انگریزی میں بولنا شروع کر دیتا اور وہ ٹرمز بولتا جن کا مجھے علم نہیں تھا۔ اچھا، ایسا نہیں کہ مجھے انگریزی نہیں آتی — مجھے بہت اچھی آتی ہے، میں آرام سے اگلے بندے کی بات سمجھ لیتا ہوں اور اپنی بات بھی سمجھا سکتا ہوں۔

خیر، یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انگریزی بولنے سے لوگ انہیں زیادہ سنیں گے، جبکہ ایسا صرف کچھ خاص جگہوں پر ہوتا ہے۔ اب جو بھی ڈاکٹر آتا، انگریزی میں بولنا شروع کر دیتا، اور سب لوگ اپنی اپنی باتوں میں لگ جاتے، کوئی بھی انہیں نہیں سنتا۔ ایک بندہ آیا اور بڑی تیزی سے انگریزی بولنے لگا، شاید گھر میں چار دن ایکسنٹ کی پریکٹس کر کے آیا تھا۔ ایکسنٹ تو بہت اچھا تھا، مگر اس کی بات بھی کسی نے نہیں سنی۔

پھر ہماری ڈاکٹر کی باری آئی، ڈاکٹر امبر۔ وہ گئیں اور انہوں نے بہت اچھا لیکچر دیا، مگر انہوں نے بھی انگریزی میں! اچھا، میں ایک چیز سمجھتا ہوں کہ جب ہم اپنے ہی لوگوں میں بیٹھے ہیں تو انہیں ان کی زبان میں سمجھانا چاہیے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں۔ یہ ساری پریزنٹیشن صرف دکھاوے کے لیے تھی — بس خود کو بہترین شو کرنے کے لیے! کیونکہ نہ تو کوئی وہاں سمجھنے کے لیے آیا تھا اور نہ ہی کوئی سمجھانے۔ زیادہ تر لوگ صرف کھانے کے لیے آئے تھے۔ ہم بھی کوئی سمجھنے نہیں آئے تھے، ہم بھی کھانے کے لیے ہی آئے تھے!

میں نے ڈاکٹر امبر سے کہا، "ڈاکٹر امبر، ٹینشن نہیں لینی! اگر جیت گئے تو زندہ باد، اگر نہیں تو تاندلی کارولا ڈال دیں گئے! ٹینشن تو لینی ہی نہیں، ہم یہی سمجھ لیں گئے ان کا انعام اگر بیچ بھی دیا جائے، تب بھی جو کھانا انہوں نے رکھا ہے، وہ نہیں آ سکے گا!"

ایک تو ہمارا ٹیبل انہوں نے ایک سائیڈ پر لگا دیا گیا تھا، مگر اس کا ہمیں بہت فائدہ ہوا کیونکہ کھانے کا انتظام ہمارے بالکل پاس تھا—اور ہم تو اسی کے لیے آئے تھے! میں نے ٹنڈے سے کہا، "آپ دیکھیں گی کہ پانچ سات سال کی تعلیم کا کیسا ستیاناس ہوتا ہے جب کسی بندے کی آواز لگے گی: 'روٹی کھل گئی اے!' جیسے شادیوں پر تباہی مچ جاتی ہے، ویسے ہی یہاں بھی ہو گا!"

ہماری الٹی طرف انہوں نے ایک موٹا سا بندہ بٹھایا تھا۔ میں نے مذاق میں ڈاکٹر سے کہا، "اگر اس گینڈے کو قربان کیا جائے تو گوشت اچھا خاصا نکل آئے گا!" اچھا، اس کا کام یہ تھا کہ جب بھی کوئی ڈاکٹر پریزنٹیشن دینے آتا اور اس کا وقت مکمل ہوتا، تو وہ ایک کارڈ لے کر کھڑا ہو جاتا جس پر لکھا ہوتا: "TIME UP"۔

اوپر سے اتنے سارے ڈاکٹرز تھے، مزیدار کھانے کی خوشبو ہمارے سامنے تھی، اور ایک بندہ وہاں کھڑا کیا گیا تھا تا کہ پریزنٹیشن سے پہلے کوئی کھانے کے قریب نہ جا سکے۔ مجھے اسے دیکھ کر غصہ چڑھ رہا تھا کہ "یہ بے غیرت یہاں کیوں کھڑا کیا ہوا ہے؟" جب بھی کوئی ڈاکٹر آتا، ہم لوگ اپنے ٹیبل پر بات کرتے، کہ کاش وہ "گینڈا" فوراً کھڑا ہو جائے کہ "بس، ٹائم ختم ہو گیا!"

میں اور وقار آپس میں بات کر رہے تھے کہ "کتنا اچھا ہو اگر کوئی ڈاکٹر اسٹیج پر آئے اور کہے: 'میں اس ٹاپک پر پھر کبھی بول لوں گا، سب وہ کریں جس کے لیے آئے ہیں— کہ روٹی کھل گئی ہے!'"

میں نے وقار سے کہا، "آؤ، باہر گھوم کر آتے ہیں۔" وہ کہنے لگا کہ "یار، اب کھانا کھلنے والا ہے، اس وقت کسی قسم کا رسک نہیں لینا! کہیں ایسا نہ ہو کہ دوبارہ اندر ہی نہ آنے دیں!" خیر، اس کے بعد کھانا آخر کار کھل ہی گیا اور ہم کھانے کے بعد وہاں سے نکل کر ہسپتال واپس آ گئے۔

آج میں اتنا زیادہ تھک گیا تھا کہ جس کا کوئی حساب نہیں! اوپر سے سویا بھی بہت کم تھا۔ مگر اس سارے دن میں جو سب سے بڑی چیز میں نے سیکھی، وہ یہ تھی کہ وہاں جو سارے ڈاکٹر انگلش میں ٹاپک پر بول رہے تھے، میں اس سے بھی بہتر طریقے سے بول سکتا تھا! اگر وہاں کوئی ان پڑھ بندہ بھی بیٹھا ہوتا، تو وہ بھی موٹی موٹی باتیں آرام سے سمجھ لیتا۔ میں اس انداز میں بول سکتا تھا کہ لوگ میری بات کو دھیان سے سنتے، میں ان سے ہنسی مذاق بھی کرتا، اور وہ ہنستے ہنستے میری بات سمجھ سکتے تھے۔

پتہ نہیں لوگ اپنی زبان کو سمجھانے کے لیے استعمال کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ بے وقوفی نہیں کہ لیکچر دینے والا بھی اردو کا ماہر ہو، اور سننے والا بھی، پھر بھی پڑھانے والا انگریزی میں لیکچر دے، اور سننے والا بھی زبردستی انگریزی میں سمجھنے کی کوشش کرے؟ دوسری زبان کا مقصد تو ذاتی سطح پر موثر رابطہ ہوتا ہے!

میں ہمیشہ اپنی بات سمجھانے کے لیے اردو ہی استعمال کرتا ہوں، مگر ہاں، جب کسی پڑھے لکھے بندے سے بات ہو، تو انگریزی میں بات کرتا ہوں۔ یہ اس لیے نہیں کہ میں انگریزی کو زیادہ تعلیم یافتہ زبان سمجھتا ہوں، بلکہ اس لیے کہ اگلا بندہ مجھے انڈر ایسٹی میٹ نہ کر سکے! میں کسی کو موقع ہی نہیں دینا پسند کرتا کہ وہ میری صلاحیتوں پر شک کرے۔

دوسری چیز جو میں نے آج سیکھی وہ یہ کہ سیاحتی مقامات پر لوگوں کی بے وقوفیوں کا کوئی جواب نہیں! اندرونِ لاہور بہت پیارا ہے، مگر وہاں کے آس پاس عجیب طرح کا رش ہوتا ہے۔ لوگ بائیکیں اِدھر اُدھر گھسا رہے ہوتے ہیں، کئی دفعہ تو ہم بھی ٹکرانے سے بال بال بچے!

اب ہم تو ان حرکتوں کے عادی ہیں، مگر میں نے ٹھنڈے سے کہا، "آپ کو احتیاط کرنی پڑے گی، کیونکہ یہاں لوگ ڈرائیونگ اندھوں کی طرح کرتے ہیں!"

دوسری چیز جو میں نے دیکھی، وہ یہ تھی کہ ان خوبصورت جگہوں پر مانگنے والوں کا ایک پورا نیٹ ورک بٹھایا گیا ہے۔ یہ واقعی غریب نہیں ہیں، بلکہ انہوں نے اسے کاروبار بنا رکھا ہے! شاید سو میں سے ایک بندہ واقعی غریب ہو، مگر پھر بھی ان جگہوں پر بیٹھنے نہیں دینا چاہیے!

ان لوگوں کی وجہ سے باہر سے آنے والے یہ سوچتے ہیں کہ شاید یہ پورا ملک ہی ایسا ہے!

وہاں میں نے کچھ آرٹ کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں دیکھیں جو پنجاب کا کلچر شو کروا رہے تھے۔ کپڑوں اور تصویروں پر پرانے زمانے کی کڑھائی کر رہے تھے، مگر خود مغربی لباس پہنے بیٹھے تھے! یہ تو سیدھی بے وقوفی ہے! ہر جگہ کا اپنا مخصوص لباس ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی بندہ خلا میں جانے والا اسپیس سوٹ پہن کر سمندر میں چلا جائے، اور کوئی بندہ سمندر میں پہنا جانے والا لباس پہن کر خلا میں چلا جائے! یہ کوئی عقل مندی نہیں!

2025/02/20

"بعد کا کچھ پتا نہیں"

آج جب میں اٹھا تو بارش ہو رہی تھی۔ مجھے کبھی کبھی بارش بہت اچھی لگتی ہے اور کبھی کبھی نہیں۔ میں نے ایک جگہ بڑا خوبصورت جملہ پڑھا:

"میں کیسے مان لوں تم وفادار ہو، کیونکہ تم وہ کرتے نہیں جو بولتے ہو، اور وہ بولتے نہیں جو کرتے ہو۔ جیسے تم کہتے ہو کہ مجھے بارش پسند ہے، اور جب بارش ہوتی ہے تو تم چھتری نکال کر خود کو بارش کے پانی سے بچانے لگ جاتے ہو۔"

آج میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سین تھا۔ آسمان سے پانی اترنا، جھیلوں پر گرنا، اور بلند و بالا پہاڑوں کے نظارے بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر جب میدانی علاقے کی بات ہو تو پنجاب کی خوبصورتی لاجواب ہے۔ ہریالی کے کھیتوں میں کھڑے ہو کر بارش کا احساس کرنا دنیا کے بہترین احساسات میں سے ایک ہے۔

ہم لوگوں کی ایک بہت بری عادت بن چکی ہے کہ ہم ہر چیز کو ہی ایک غلط نظر سے دیکھتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم نے ہر چیز کو غلط ہی دیکھا ہے۔ ہمارے لیے یہ ساری چیزیں اتنی عام ہو چکی ہیں کہ ہمیں اب ان مناظر کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

دوسری طرف، ہم لوگ ہر روز اس بارش کی وجہ سے کھڑے ہونے والے گندے پانی اور کیچڑ سے نبٹتے رہتے ہیں۔

ہمارے لیے ٹریول کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے شاید جو بھی شخص ایسے محلوں میں رہتا ہو، وہ بارش کو اتنا پسند نہیں کرتا۔ جسے پتا ہو کہ اگر بارش ہو گئی تو اس کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی، وہ بارش کو کیسے پسند کرے گا؟

کوئی بھی شخص اپنے لیے مشکل اور مشکل کی وجہ کو پسند نہیں کرتا۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید اگر مشکل نہ آئے تو ہم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس دنیا سے جانے کے لیے بھی موت جیسی مشکل سے گزرنا پڑتا ہے، ورنہ ہم اس دنیا سے جا ہی نہ سکیں۔

خیر، آج بارش کے ساتھ ساتھ آخری درجے کی سردی بھی تھی۔ میں نے آج شیمل ہاؤس بھی جانا تھا، لیکن مجھے لگا کہ شاید نہ جا پاؤں۔ میں ہر طرف سے یہی سوچ رہا تھا کہ دو گھنٹے کا سفر کر کے جانا ہے، کیسے جا سکوں گا؟

دوپہر ایک بجے کے قریب بابا نے پوچھا، "میں نے آفس جانا ہے، اگر تمہیں بھی جانا ہے تو آ جاؤ، میرے ساتھ ہی چلو۔"

میں نے سوچا کہ گھر بیٹھنے سے تو بہتر ہے کہ چلتے ہیں۔ میں نے بابا کو بتایا کہ میں نے شیمل ہاؤس سے ہو کر جانا ہے۔ وہاں

سے ہو کر میں لینگوئج سینٹر پہنچا، جہاں گنتی کے چند بچے ہی آئے ہوئے تھے۔ بالکل تھوڑے سے۔ میرا دوست بھی مجھے کہانی کروا گیا۔

خیر، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ ایسے موقعوں پر ایسے ہی کرتا ہے۔

اب لینگوئج سینٹر میں کوئی آیا ہی نہیں تھا، اور میں کلاس میں اکیلا بیٹھا تھا۔ میرا ابھی پڑھنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں نے موبائل نکال کر اپنے کالج کے دوستوں کا ایک گروپ بنایا تاکہ ہم سب آپس میں مشورہ کر سکیں کہ کس دن اور کہاں ملنا ہے۔ پورے سال کے بعد اکھٹے ہونے کا پلان تھا۔ ایسا ہوتا ہے کہ جب آپ ایک جگہ سے آگے بڑھ جاتے ہیں، تو بس پھر ایسے ہی ملتے ہیں، مگر یہ ملنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوتا، خاص کر اس شخص کے لیے جو دونوں پارٹیز کے درمیان میں بیٹھ کر فیصلہ کرنے والا ہو۔

کالج کے اندر جب میں آئی سی ایس سے میڈیکل کی کلاس میں شفٹ ہوا تھا، تب یہ کلاس کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی، کیونکہ میں ان لوگوں کے لیے نیا تھا، تو یہ لوگ بھی مجھے کچھ نئے لگے۔ مجھے ان میں ایڈجسٹ ہونے میں پورا مہینہ لگ گیا۔ میں نے کچھ انہیں سکھایا، کچھ ان سے سیکھا، اور اس طرح کلاس کا ماحول بدلنے کی کوشش کی، جس میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہو گیا، مگر ویسے نہیں کر سکا جیسے میں چاہتا تھا۔

اب میں آپ کو کالج کے کچھ دوستوں کا تعارف کرواتا ہوں، جن کے ساتھ ملنے کا پلان بن رہا تھا۔ باقیوں کے ساتھ اتنا زیادہ کنٹیکٹ نہیں ہے، اس لیے ان کا ذکر نہیں کر رہا۔

میمن

اس کا اصل نام توشر جیل ہے، مگر میں نے جب اسے پہلی دفعہ دیکھا تو یہ بندہ مجھے تھوڑا سا عجیب لگا، کیونکہ یہ کلاس کا سی آر بھی تھا اور بولنے کا انداز بھی کچھ الگ تھا۔ اس کی ایک عادت مجھے بہت بری لگتی تھی کہ یہ ہر جگہ عجیب طرح سے گھسنے

کی کوشش کرتا تھا اور دوسروں کی رائے کو نہ مان کر اپنی رائے مسلط کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ خیر، اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بہت اچھا بندہ ہے، برا نہیں۔ جب میں پہلی بار ان کی کلاس میں گیا تو سب اسے شرجیل میمن کہتے تھے، جو سندھ کا ایک سیاستدان بھی ہے، اور یہ بات مجھے تب ہی پتا چلی۔ میں نے پوچھا کہ "یہ میمن کیا ہے؟" تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایک ذات ہوتی ہے۔ مجھے لگنے لگا کہ شاید یہ بندہ میمن ہے۔ اس کے بعد ہماری دوستی ہوئی اور بہت اچھی، مضبوط دوستی ہو گئی۔ پورے ڈیڑھ سال بعد مجھے پتا چلا کہ اس کی ذات میمن نہیں بلکہ کچھ اور ہے، بس اس کا نام ہی اس سیاستدان کی ذات سے اٹھایا گیا تھا۔ چونکہ میں تو اسے میمن ہی کہتا تھا، میں نے کہا، "میمن! اب تم میرے لیے ہمیشہ میمن ہی رہو گے۔"

اسد

یہ بھی ایک اچھا دوست رہا ہے، مگر کچھ چیزیں مجھے اس کی بھی غلط لگتی تھیں۔ شروع شروع میں میں بہت آرتھوڈوکس قسم کا بندہ تھا، اور اسد میرے دوستوں سے کہتا تھا، "یار، اسے کہنا کہ ہماری مستی میں مسئلہ نہ پیدا کرے۔" شاید میں کچھ زیادہ ہی سخت تھا، اور یہ بات مجھے اس کی، میرے دوستوں سے، میرے پیچھے سے کہنا اچھی نہیں لگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے یہ باتیں مجھے خود کہنی چاہیے تھیں، مگر شاید جو میرے لیے غلط ہے وہ سب کے لیے غلط نہ ہو۔ خیر، باقی اسد کے ساتھ بہت مزہ آیا۔

خضر

اس کے ساتھ میری زیادہ بات چیت نہیں رہی، بس کبھی کبھار کوئی سوال جواب ہو جاتا تھا، مگر بہت زیادہ نہیں۔ یہ لوگ ایک گروپ کے تھے، اور ان کے گروپ میں کچھ اور لوگ بھی شامل تھے۔ کلاس میں ان کا شروع سے ایک الگ گروپ بنا ہوا تھا۔

احتشام، عبید، مرتضیٰ، اور اریب

یہ سب بھی اپنی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ احتشام کے ساتھ میرا زیادہ آنا جانا تھا، اس لیے ہمارا کنٹیکٹ زیادہ تھا۔ ہم مذاق بھی کرتے تھے۔ احتشام مذاق تو کرتا تھا، مگر سخت بھی تھا، اور جلدی کسی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ مل کر ہم دونوں نے بڑے بڑے کام ڈالے ہوئے ہیں۔

عبید

یہ ہماری کلاس میں ایک عجیب سالڑ کا تھا۔ اس کی احتشام کے ساتھ سب سے اچھی دوستی تھی، باقیوں سے اس کا زیادہ تعلق نہیں تھا۔

گروپ میں سب کو ایڈ کر کے بات چیت شروع ہوئی، مگر دوستوں کے آپس میں ملنے کے فیصلے کہ کس دن ملنا ہے اور کہاں ملنا ہے، کبھی فائنل نہیں ہو پاتے۔

یہ باتیں ہونے لگیں کہ کہاں جانا ہے۔ میں نے رائے دی کہ اندرون لاہور چلتے ہیں۔ کچھ نے ہاں کر دی، کچھ نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا، "آپ لوگ خود بتا دیں کہ کہاں جانا ٹھیک رہے گا۔" کسی نے کچھ رائے دی، کسی نے کچھ، مگر کوئی بھی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو رہا تھا۔ آخر میں نے کہا، "چلو یار، اندرون ہی چلتے ہیں۔"

میمن کہنے لگا، "وہاں کیا دیکھنا ہے؟ میں بہت دفعہ گیا ہوں، وہاں کچھ خاص نہیں۔"

میں نے کہا، "چلو یار، کیونکہ ایسے تو فیصلہ نہیں ہونا۔ ہر جگہ ہم پہلے ہی جا چکے ہیں، اس لیے بس اندرون فائنل کر لو، ورنہ کوئی کبھی کسی کی بات پر ایگری نہیں کرے گا۔ اور کوئی کسی کی"

پھر ایک اور مسئلہ بن گیا کہ کس دن جانا ہے۔ میمن کے گروپ نے کہا کہ اتوار کو چلتے ہیں، جبکہ عبید کے گروپ نے ہفتے کا دن تجویز کیا۔ اس پر کافی بحث چھڑ گئی۔

میں نے ایک میسج کر دیا کہ اگر میں ہفتے کا فیصلہ کروں تو باقی لوگ کہیں گے کہ میں نے ان کا ساتھ دیا، اور اگر اتوار کا فیصلہ کروں تو دوسرے کہیں گے کہ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ پھر عبید نے کہا، "میں اتوار کو نہیں آ سکتا، مجھے گاؤں جانا ہے، آپ لوگ چلے جائیں، کوئی مسئلہ نہیں۔ میں تو صرف احتشام سے ملنے آنا چاہتا تھا۔"

یہ بات مجھے بھی عجیب لگی، مگر میں نے نظر انداز کر دیا، کیونکہ وہ شروع سے ہی ایسا تھا۔ باقی دوستوں نے تو اس بات کو پکڑ لیا اور طنزیہ جملے کسنے لگے کہ "نہ آؤ" وغیرہ وغیرہ۔ خیر، میں نے یہ جھگڑا یہ کہہ کر ختم کروایا کہ ابھی اتوار فائنل کر لیتے ہیں، اور عید کے فوراً بعد جو پہلا ہفتہ آئے گا، وہ "عبید ڈے" ہو گا، تب سب پھر اکھٹے ہو جائیں گے۔ پھر میں نے کہا، "کوئی بھی شخص بائیک لے کر نہیں آئے گا، ہم لوکل ٹریول کریں گے۔" اس کی وجہ یہ تھی کہ پارکنگ کا کئی جگہ بہت مسئلہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اپنی سواری پر مزہ آتا ہے، مگر پیدل ہر جگہ گھومنے کا ایک الگ ہی لطف ہوتا ہے۔

دوستوں میں دن کا فیصلہ کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ایگری نہیں کرتا، کبھی کوئی۔ ہاہاہا! اتنی ساری باتیں کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ اتنی دور لینگویج سینٹر آیا ہوں تو کچھ پڑھ بھی لوں۔ میں نے کچھ الفاظ یاد کیے، کچھ گرامر رولز پڑھے، اور پھر سر کو ٹیسٹ دیا۔ اس کے بعد چھٹی کر کے کھانے چلا گیا، کیونکہ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔

مجھے اکیلے کھانے میں عجیب سا ڈر لگتا ہے۔ میرے لیے یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ میں اکثر اکیلے کھانا کھانے نہیں جاتا۔ یہ ایک عجیب سا خوف ہے۔ خیر، وہاں سے میں بابا کے آفس چلا گیا، اور پھر وہاں سے واپس گھر۔

راستے میں جب ہم راوی کے پل سے گزر رہے تھے، تو رات کے اندھیرے میں فل سردی کے درمیان اوپر کالے بادل چھائے ہوئے تھے، اور دور دور گھروں کی رنگ برنگی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ بہت دلکش نظارہ تھا۔

آج کے دن سے میں نے ایک بات سیکھی کہ جب بھی ہم لوگ آپس میں ملیں، تو ہمیں سکون اور محبت سے ملنا چاہیے۔ کبھی کبھی ہمیں اپنے ضروری کام بھی چھوڑ دینے چاہئیں، کیونکہ ہم نے کون سا روز روز ملنا ہوتا ہے؟

ایک انسان کو سمجھنا چاہیے کہ جب وہ مر بھی جائے گا، تب بھی زندگی کے کئی کام ادھورے ہی رہیں گے۔ کام کبھی ختم نہیں ہونے۔ اور جب کوئی شخص بستر مرگ پر بے یارو مددگار پڑا ہوتا ہے، تب وہ سوچتا ہے کہ میں نے ساری عمر کام کیے، مگر ختم نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ بعد میں زندگی کو انجوائے کروں گا، مگر وہ "بعد" کبھی نہیں آیا، وہ دن کبھی آتا بھی نہیں۔

اسی لیے آج مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کام کے ساتھ ساتھ ابھی انجوائے کرنا چاہیے، کیونکہ بعد کا کچھ پتا نہیں۔ نہ یہ کہ ہم ہوں گے یا نہیں، اور نہ یہ کہ وہ ہوں گے جن کے ساتھ ہم نے زندگی انجوائے کرنی تھی؟

2025/02/22

"میں وہی ہوں جو میں ہوں"

زندگی ایک اتنی پیچیدہ چیز ہے کہ آپ اسے جتنا وقت سمجھنے میں لگائیں گے، اتنی دیر میں زندگی ختم ہو جائے گی۔ مگر پھر آخری افسوس اسی بات کا رہ جائے گا کہ ہم زندگی کو مکمل طور پر سمجھ نہیں سکے۔ آج بھی دنیا کے 80 فیصد لوگ زندگی کو سمجھنے میں ہی وقت ضائع کر رہے ہیں، حالانکہ زندگی سمجھنے کا نام نہیں، جینے کا نام ہے۔ زندگی کو جینا چاہیے، نہ کہ سمجھنا۔

شاید ہم لوگ کبھی کبھی کچھ چیزیں روز کرنے کا سوچتے ہیں تاکہ ایک ریگولر سسٹم چلا سکیں، مگر اکثر زندگی کے حالات اور واقعات اس طرح کے بن جاتے ہیں کہ شاید ہم اسے مکمل طور پر ویسے نہیں چلا پاتے جیسے ہم اکثر چاہتے ہیں۔ میں چاہتا

تھا کہ اپنے دنوں کے واقعات ترتیب سے چلاتا چلوں، مگر ایسا مکمل نہیں ہو سکا۔ اب، آج میں اپنے کل اور آج کے واقعات کو اکٹھا بتاتا ہوں۔

ایک اور چیز بڑی اہم ہے، وہ یہ کہ کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ جو کچھ میں بولتا ہوں اور سوچتا ہوں، وہ ویسے ہی ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ میں بولتا ہوں یا سوچتا ہوں، وہ اس کے الٹ ہوتا ہے۔ مگر میں ان سب چیزوں کو محض اتفاق ہی مانتا ہوں۔ ایسا صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوتا، بلکہ بہت سارے لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔

اور لوگ اس بات پر کبھی کبھی ٹینشن میں بھی آجاتے ہیں، جس کو اکثر لوگ "کالی زبان" والے بھی کہہ دیتے ہیں۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ لوگ خود بھی اس بات کو مان لیتے ہیں۔ بھلا ایسا ممکن ہے کہ جو کچھ وہ سوچیں، وہی ہو؟ مثلاً، اگر ایک شخص بری طرح زخمی ہو اور وہ کہے کہ اس کے سارے زخم ایک ہی دن میں ختم ہو جائیں گے، تو کیا ایسا ہو گا؟ ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ ویسے تو عام طور پر کالی زبان والا اس کو کہتے ہیں جو کسی بری چیز کے بارے بولے اور ویسے ہی ہو جائے مگر یہ سب کچھ اتفاق ہوتا ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

خیر، کل میرے دن کی ابتدا بھی کچھ اسی طرح ہوئی۔ شاید آنے والی مشکلات کا کسی کو اندازہ نہیں ہوتا، اور انسان خود بھی زندگی کی طرح کئی بار خود کو سمجھ نہیں پاتا۔ شاید اسی لیے ایک انسان کو، جو خود کو سمجھنا شروع کر دے، پوری زندگی لگ جاتی ہے۔ ہم لوگ دنیا کے لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر کبھی خود کو، سمجھ ہی نہیں پاتے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میرا دل بہت نرم تھا، میں کبھی بھی کسی جانور کو ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا، اور ابھی بھی ایسا ہی ہے۔ میں اب بھی ذبح ہوتے جانور کو دیکھنے سے گریز کرتا ہوں، یہاں تک کہ میں جانور کے زخم بھی نہیں دیکھ پاتا۔ میرا دل ڈر جاتا ہے، اور میرے دماغ میں طرح طرح کی سوچیں آنے لگتی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے میں کوٹ عبد المالک بابا کے ساتھ ایک فیکٹری میں گیا۔ وہاں فیکٹری کے باہر میں نے ایک گدھا دیکھا جس کا اگلا پاؤں ٹوٹا ہوا تھا، اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہوا، مگر میں شدید افسردہ ہو گیا۔ دوسری طرف، انسان جانوروں سے زیادہ افضل ہے، لیکن میں انسان کے زخم کو آرام سے دیکھ لیتا ہوں اور اس کے ساتھ ڈیل بھی کر لیتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی۔

میری پوری تعلیم میں کسی نے مجھے یہ نہیں سکھایا کہ خود کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے۔ شاید میری یہ حالات اچھی چیز ہے، اور شاید بہت بری، مگر میں ایسا ہی ہوں۔

کل صبح جب میں اٹھا تو میری طبیعت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میرا ناک بند تھا، بلغم بھی ہو رہی تھی، اور سر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ خیر، جمعہ تھا، اور بابا نے مجھے بتایا کہ آج مجھے خود جانا ہے۔ میں گھر سے نکلا اور لینگویج سینٹر کے لیے روانہ ہو گیا۔ دوست نے کال کر کے بتایا کہ وہ پارک میں ہے، میں وہاں آجاؤں تاکہ اکٹھے جا سکیں۔ میں اس کے پاس پارک میں چلا گیا، جو لینگویج سینٹر کے قریب ہی تھی۔

وہاں میں نے اس سے تھوڑا گلہ کیا کہ اپنے کاموں میں مجھے تختۂ مشق نہ بنایا کرو، اپنے معاملات خود ڈیل کیا کرو، اور مجھے آزاد رکھا کرو۔ خیر، پتا نہیں اس نے اس بات کا برا منایا یا نہیں، کیونکہ وہ عام طور پر ایسی باتوں کا برا منا جاتا ہے جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتی ہیں، مگر اب مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وہ یہ بات نہیں سمجھ سکتا، تو ایسے دوست سے دوستی نہ ہونا ہی بہتر ہے۔

خیر، وہاں سے ہم لینگویج سینٹر کی طرف روانہ ہوئے اور جا کر پڑھا۔ ہمارا ایک اور ساتھی کہنے لگا کہ ہم کھانے کے لیے باہر جائیں گے۔ میرے پاس زیادہ پیسے نہیں تھے، اس لیے میں منع کر رہا تھا، مگر وہ دونوں بضد ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم میٹھا کھانے جائیں گے۔ مجھے لگا کہ ہم آئس کریم کھا کر واپس آ جائیں گے، مگر جب ہم مارکیٹ پہنچے، تو وہاں کوئی سٹال ہی نہیں تھا۔ حکومت نے سارے سٹال ہٹا دیے تھے۔

میں اس اقدام کو ایک اچھا فیصلہ سمجھتا ہوں کیونکہ یہ سٹال غیر ضروری ٹریفک کا باعث بنتے تھے۔ جو لوگ اس کے خلاف ہیں، میں تو انہیں بے وقوف ہی سمجھتا ہوں، کیونکہ یہی لوگ ہر وقت روتے ہیں کہ حکومت کچھ نہیں کرتی، ملک کا حال خراب ہے، مہنگائی زیادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی نہ کسی نے تو یہ اقدامات کرنے ہی تھے تاکہ مسائل حل ہوں۔ اب جب حکومت نے سٹال ہٹا دیے، تو ان کا نیا رونا یہ ہے کہ ان کا روزگار ختم ہو گیا۔ بھلا یہ کیسا روزگار ہے جو دوسروں کو تکلیف دے کر کمایا جائے؟

ٹریفک جام کی وجہ سے نجانے کتنی ایمبولینسیں روزانہ پھنس جاتی ہیں، اور مریض اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ ہمارا ایک قدم ہمارے لیے صرف ایک قدم ہوتا ہے، مگر ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ نجانے کتنے لوگوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

خیر، وہاں جا کر ہمارا ساتھی کہنے لگا کہ ہم کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے چلتے ہیں۔ میں نے بار بار منع کیا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، مگر پھر بھی ہم چلے گئے اور کھانا آرڈر کر کے کھا لیا۔ بعد میں بل کافی زیادہ آ گیا۔ شاید ہمارا ساتھی ہی ہمیں کھلانے والا تھا، مگر جب وہ بل دینے لگا تو میں نے اپنا حصہ ڈال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بندے پر سارا بوجھ آ جائے۔ وہاں سے ہمارا ساتھی چلا گیا، اور اب میں اور میرا دوست رہ گئے۔ ہم دونوں گھر کی طرف نکلے۔ اس نے مجھے بس سٹاپ پر اتارنا تھا، مگر وہاں اتنی زیادہ ٹریفک جام ہو گئی اور ہم بری طرح پھنس گئے۔

اوپر سے رات کے 8:30 بج رہے تھے، اور بس 9 بجے بند ہو جاتی تھی۔ میرا گھر بھی کوئی دو گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ بڑی مشکل سے میں بس اسٹاپ پر پہنچا اور گھر کے لیے روانہ ہوا۔ میں تقریباً 10:30 پر گھر پہنچا، اپنے کمرے میں آیا اور بیٹھ کر موبائل چلانے لگا۔

کھانا تو کھا لیا تھا، اس لیے بھوک ذرا سی بھی نہیں لگ رہی تھی، مگر طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ 11:00 بجے بابا میرے کمرے میں بھاگتے ہوئے آئے اور بولے، "جلدی چلو، تمہاری ماما کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے!"

میں جلدی سے اٹھا اور باہر کی طرف دوڑا کہ گاڑی سے کپڑا اتاروں۔ اتنا سوچنے کا ٹائم ہی نہیں تھا کہ کیا کیا اٹھانا ہے، صرف موبائل ہی میرے پاس تھا۔ بھاگ کر گاڑی کا کپڑا اتارا۔ ہمسائے کے لڑکے نے آواز دی، "اوئے اوئے، آرام سے! کیا ہوا ہے؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں اور بابا گاڑی میں بیٹھے۔ میری بہن باہر آئی اور پوچھنے لگی، "کیا ہوا ہے؟" میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ پریشان ہو، اس لیے میں نے کہا، "کچھ نہیں ہوا۔" شاید میرے علاوہ سب پریشان ہو گئے تھے، مگر شاید میں پتھر دل ہو گیا ہوں جو میں پریشان نہیں ہوا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اچھی بات ہے یا بری۔ اچھی اس لیے کہ میں ڈرا نہیں کیونکہ جو ڈر جاتا ہے، وہ معاملات کو سنبھال نہیں سکتا، اور بری اس لیے کہ میرا دل کسی بھی انسان کی تکلیف پر جلدی موم نہیں ہوتا۔

مجھے اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ میری اپنی والدہ کے وقت بھی میرے ساتھ ایسے ہی ہو گا۔ خیر، میں نے بابا سے سوال پوچھنا شروع کر دیے: "کیا ہوا؟ کہاں ہیں؟ کیسے ہوا؟" بابا نے کہا، "مجھے بھی زیادہ نہیں پتا، کیونکہ میرے چھوٹے بھائی نے کسی کے نمبر سے کال کر کے یہ سب کچھ بتایا تھا۔" بابا نے مجھے نمبر دیا، میں نے کال کی اور پوچھا، "کہاں ہو؟" اس نے بتایا کہ وہ موٹروے سٹی کے ڈاکٹر کے کلینک پر ہیں۔

یہ وہی کلینک تھا جو جب بنا تھا، تو میں نے ہی سنبھالا تھا۔ اس کی ابتدائی مینجمنٹ میں ہی کر تا رہا ہوں، اس لیے ڈاکٹر اور آنے والا سارا عملہ مجھے اور میرے گھر والوں کو جانتا تھا۔ شاید وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ میری والدہ کو سر میں چوٹ آئی تھی اور کلینک ایسی چوٹوں کو جلدی ڈیل نہیں کرتے، وہ مریضوں کو اسپتال بھیج دیتے ہیں۔

میں بھاگ کر کلینک میں داخل ہوا۔ بہت سارے لوگ میری والدہ کے گرد اکٹھے تھے۔ میرا بھائی مجھے دیکھتے ہی رونے ہی لگا۔ میں نے کہا، "چپ کر جا، اور سائیڈ پر ہو جا۔" میں نے کیچر اتارا اور زخم کو صاف کرنا شروع کیا۔ زخم کافی بڑا تھا۔

میں نے ماما سے ہاتھ سے نمبر بنا کر سوال کیے، "یہ کتنے ہیں؟ میں کون ہوں؟" انہوں نے ٹھیک جواب دیے، مگر تھوڑی دیر بعد انہیں چیزیں یاد آ جاتیں اور پھر اچانک بھول جاتیں۔ پھر انہوں نے الٹی بھی کر دی، جو ایک صحیح علامت نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے کہا، "انہیں ہیماٹوما ہو گیا ہے، ان کو میو اسپتال لے جاؤ اور سی ٹی اسکین کرواؤ۔"

ہم فوراً اسپتال پہنچے۔ میرا بڑا بھائی، وہاں پہلے ہی موجود تھا۔ ہم والدہ کو لے کر ایمرجنسی گئے اور ڈاکٹر کو سب بتایا۔ خیر، جو اسپتالوں کی عام خجل خواریاں ہوتی ہیں، وہ ہوئیں۔ پھر ہم ایکسرے کروانے چلے گئے، جہاں ایک گارڈ سے میری لڑائی ہو گئی۔

میں، میرا بڑا بھائی، اس کے دوست اور ہماری ہمسایہ آنٹی ہم سب ساتھ تھے۔ گارڈ نے کہا، "پرچی دکھاؤ۔" میں نے اپنی آنٹی سے پوچھا، "پرچی دی ہے؟" انہوں نے اشارے میں سر ہلایا۔ گارڈ کہنے لگا، "باہر نکلو۔" پھر اس نے دوبار مجھے پیٹ پر ہاتھ لگایا۔ میں نے غصے سے کہا، "مجھے دوبارہ مت چھونا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا! اور تم مجھے یہاں سے نکال نہیں سکتے!"

وہ کہنے لگا، "یہ اسپتال کے اصول ہیں۔ میں نے کہا میری تقریبا ساری عمر اسپتالوں میں ہی گزری ہے، اور تم مجھے اسپتالوں کے اصول سکھاؤ گئے، جو خود بے اصول ہے!"

ایک موٹے آدمی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، "ٹھنڈے ہو کر بات کرو۔" میں نے کہا، "تمہارا کوئی کام نہیں، اپنے کام سے کام رکھو!"

میرا بھائی بھی میرے پیچھے آ گیا اور بولا، "تم لوگ بکواس بند کرو اور پیچھے ہٹو!" میری آنٹی چھڑانے لگیں، میں نے کہا، "آپ پیچھے ہو جائیں!" موٹا آدمی بولا تو آنٹی کہنے لگیں، "چپ کر جاؤ! پیچھے لڑکے بہت کھڑے ہیں، بہت ماریں گے!" گارڈ ڈر گیا، کیونکہ اگر ہم پکڑ لیتے تو واقعی بہت مارتے۔ بعد میں جو ہوتا، دیکھا جاتا۔ شاید کچھ لوگ ہمیں غلط کہیں، مگر شاید وہ اسپتالوں کے حالات سے واقف نہیں۔

پولیس کو تو سب جانتے ہیں، ہر کام میں رشوت خور۔ اسپتالوں میں ایک طرف مریض مر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف نرس اور ڈاکٹر موبائل چلا رہے ہوتے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کو پکڑ کر مارنا نہیں چاہیے تو اور کیا کرنا چاہیے؟ اسپتالوں کے گارڈ لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں، پیسے مانگتے ہیں، حالانکہ ان سب کو حکومت کی طرف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ مگر رشوت کھانے کی عادت جو پڑ گئی ہے!

خیر، ہماری طاقت دیکھ کر انہیں ہٹنا پڑا۔ ہم نے اپنا کام کروالیا کیونکہ ہم حق پر تھے۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہماری جگہ کوئی مزدور یا غریب بندہ ہوتا، تو وہ کبھی بھی غالب نہیں آسکتا تھا۔ وہ تو اپنے پیارے کی لاش لے کر ہی گھر جاتا اور اپنی حلال کی کمائی ان جلادوں پر لٹا دیتا۔

یہ لوگ دوسروں کی مجبوریوں سے لوٹ رہے ہیں، حالانکہ روز دیکھتے ہیں کہ ان کے گرد لوگ مر رہے ہیں۔ ایک دن انہیں بھی مرنا ہے!

ایک تو ڈاکٹر کو میں کہہ رہا ہوں کہ سی ٹی اسکین کرنا ہے اور وہ بھی دیکھ رہا ہے کہ مریض کو ضرورت ہے، آگے سے بکواس کر رہا ہے کہ "وہ بڑا ٹیسٹ ہے، ایسے نہیں کرنا، نیورولوجسٹ لکھے گا تو لکھ کر دیں گے۔" یہ بہت گندہ رول ہے۔
ایک تو ہسپتال کا ڈیزائن ہی بہت گندہ بنایا ہوتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ کوئی بھی شخص آئے، جو ٹیسٹ وہ کروانا چاہتا ہے، وہ کرواسکے بغیر کسی کی اجازت کے۔ یہ جو اجازت والا معاملہ ہے، صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کا ہسپتال میں کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ جس کی سفارش ہے، وہ تو آرام سے لکھوالیتا ہے کہ "یہ کام کروانا ہے۔" خیر، نیورولوجسٹ سے لکھوایا کہ کرو، اور پھر جا کر سی ٹی اسکین ہوا۔ شکر الحمدللہ، وہ بالکل ٹھیک نکلا اور ہمیں چھٹی ملی۔
ٹانکے لگوا کر ہم گھر آئے۔ ہم صبح 5 بجے پہنچے۔ ماما کو تو نیند مشکل ہی آنی تھی، مگر ہم سب نڈھال ہو گئے تھے۔ میری طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ ماما کو آرام کرنے کے لیے ان کے کمرے میں چھوڑا اور میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

صبح 10 بجے اٹھا، مگر میری طبیعت سونے سے ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہو گئی۔ خیر، میں نے ماما سے ان کا حال چال پوچھا۔ انہوں نے کہا، "سر میں بہت درد ہے اور سو نہیں سکی، کوئی آدھا گھنٹہ ہی سوئی ہوں۔" تکلیف میں سونا واقعی بہت مشکل ہے۔ خیر، ان کو تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوتا، جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر وقت گزار کر پھر اوپر کمرے میں آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔
میں لیٹا تو میرے پاؤں میں کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو میرے پاؤں کا ناخن ہی اکھڑ گیا تھا! مجھے نہیں پتا کہ ایسا کب اور کہاں ہوا۔ میرے سیدھے پاؤں کا ناخن اکھڑ تو گیا تھا، مگر تھوڑا سا ابھی بھی لگا ہوا تھا، جس کی وجہ سے شاید مجھے درد نہیں ہوا اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ مگر اب میں اپنے پاؤں کو پانی میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں نے جا کر اپنے پاؤں پر عارضی پٹی کی کہ شام کو ڈاکٹر سے مشورہ کر لوں گا۔

میں نے دوائی لی اور اپنی بہن سے کہا کہ مجھے کھانا بنادو۔ اس نے بنادیا۔ دوائی کے بعد مجھے تھوڑا سکون آنے لگا۔ میں نے گھر کے کچھ ضروری کام کیے کیونکہ گھر میں مہمانوں نے آنا تھا۔ جا کر سامان لے کر آیا۔

میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ اگر کوئی بندہ بیمار ہے یا کسی مسئلے کا شکار ہے، تو اس کے گھر جا کر کھانا کھایا جائے۔ میری ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ جب بھی کسی کی تیمارداری کے لیے جاؤں تو کچھ نہ کھاؤں۔ کیا اللہ کا دیا کم ہے؟ ہر چیز کا ایک خاص وقت ہوتا ہے، ہر وقت کھانے کا ہی سلسلہ لگا کر رکھنا بہت غلط ہے۔ خیر، میرے گھر والے چاہتے تھے، تو میں جا کر سامان لے آیا اور اپنی بہن کے حوالے کر دیا۔

تب تک مجھے نیند آنے لگی اور میں آ کر سو گیا۔ جب جاگا تو میری طبیعت کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ اس کے بعد گھر میں مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں جا کر نان لے کر آیا اور ڈاکٹر کے کلینک چلا گیا، مگر ڈاکٹر وہاں نہیں تھا، البتہ اسسٹنٹ موجود تھا، جو میرا دوست بھی تھا۔ اس سے مشورہ کیا تو یہی بہتر لگا کہ جو ناخن تھوڑا سا لگا ہوا ہے، اسے بھی نکال دینا چاہیے تاکہ نیا ناخن صحیح طریقے سے آ جائے۔ چنانچہ، اس نے نکال دیا۔ جب نکالا تو ایک دفعہ تو بہت درد ہوا، مگر خیر، وہ اتر گیا۔ میں نے پٹی کروالی اور گھر آ گیا۔

سامان گھر والوں کے حوالے کیا۔ میری خالہ بھی آ چکی تھیں، مگر وہ مہمان نہیں، بلکہ گھر کا ہی ایک حصہ ہیں۔ انہوں نے اور میری بہن نے مل کر کھانا بنایا۔ میرے ہمسایوں نے بھی مدد کی اور یوں سارے مہمانوں کی مہمان نوازی مکمل ہوئی۔
کچھ آرتھوڈوکس قسم کے مذہبی لوگ بھی آئے ہوئے تھے، جن کے درمیان مجھے بیٹھنا بالکل پسند نہیں۔ کیونکہ وہ کچھ ایسی بغیر لوجکل باتیں کرتے ہیں کہ میری ان سے بحث ہو جاتی ہے۔ میں اب ان میں بیٹھنا ہی نہیں چاہتا تھا، مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ مجھے اپنے پاس بلانے میں کامیاب ہو گئے۔

ایک تو کوئی مسئلہ ہو جائے، ہر بات کو کالے جادو کی طرف لے جانا کہ "کسی نے جادو کر دیا ہے!" یہ بالکل بے عقل بات ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، وہ ایک غلط بنے ہوئے اسپیڈ بریکر کی وجہ سے ہوا، جو اندھیرے میں نظر نہیں آیا۔ مگر یہ آرتھوڈوکس قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ "خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے، اسی سے علاج کرو۔" میں مانتا ہوں کہ خدا کے کلام میں بڑی طاقت ہے، مگر ویسے نہیں جیسے یہ لوگ مانتے ہیں۔ ایک بندے کو چوٹ لگی ہے تو اس پر پٹی کرو، نہ کہ وظیفے پڑھنے بیٹھ جاؤ!

اور کمال کی بات یہ کہ جو لوگ وظیفے پڑھ رہے ہوتے ہیں، مختلف زبانوں میں، ان کے معنی برکت کی دعا اور مشکل وقت میں ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ عقل کے اندھے اپنی ہی دنیا میں مست ہیں! خیر، میں اس ٹاپک پر زیادہ بولنا نہیں چاہتا۔ بس اتنا کہتا ہوں کہ جب لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، تو یہی آرتھوڈوکس لوگ انہیں وظیفے پڑھنے کا کہتے ہیں، مگر جب خود کسی تکلیف میں ہوتے ہیں تو سیدھا ڈاکٹر کے پاس بھاگتے ہیں۔

خدا کہیں نہیں کہتا کہ اگر تمہیں تکلیف ہو تو بس میرا نام ہی جپتے رہو: "اے خدا، اے خدا، اے خدا!" بلکہ وہ کہتا ہے کہ "مجھ سے دعا کرو کہ میں تمہیں صحت دوں اور ثابت قدم رہو" کیونکہ دنیا اسباب کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ دنیا میں ایک نظام ہے، جو جیسے بنایا گیا ہے، اس نے ویسے چلتے رہنا ہے۔

2025/02/23

"زندگی کے چند عجیب دن"

میرے جیسے انسانوں کی زندگی میں ایسے دن بھی آتے ہیں جو بہت ہی عجیب طرح کے ہوتے ہیں، جیسے آج کا دن۔ میرا دن اتنا خاص نہیں تھا، سوائے چند ایک چیزوں کے۔ بہت سے لوگ اپنے گرد خاص چیزیں دیکھ نہیں پاتے، ان کے لیے تمام چیزیں بہت عام ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ ان چیزوں کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ بے کار دنوں میں بھی کچھ نہ کچھ خاص ہوتا ہے، اگر واقعی ہم محسوس کریں۔

میرا عجیب دن ویسے ہی شروع ہوا جیسے کچھ دنوں سے ہو رہا ہے۔ میری طبیعت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں تھی، اور اوپر سے اگر چھٹی کا دن ہو اور کچھ بھی کرنے کے لیے نہ ہو تو بس پورا دن طبیعت اوزار ہی رہتی ہے۔ ویسے تو میرے پاس کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں، مگر میں نے فل ہڈ حرامی کرتے ہوئے سارے کاموں کو پسِ پشت ڈال دیے، جو واقعی مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں ایک ہی بات بار بار کہتا ہوں، ایسا صرف میں نہیں کرتا، یہ مسئلہ بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہے۔ اور واقعی طور پر میں اسے مسئلہ ہی سمجھتا ہوں۔

خیر، اس فارغ اور اوزار دن میں عجیب عجیب سوچیں میرے دماغ میں ابھر رہی تھیں، جیسے: جب مکمل طور پر مجھ پر ساری ذمہ داری ڈال جائے گی، تب میں سب چیزوں کو کیسے مینج کر سکوں گا؟ شاید میں ابھی بہت پیچھے ہوں، شاید بہت پیچھے۔ اور ابھی تک وہ نہیں بن سکا جو سب چیزوں کو مینج کر سکے۔ ابھی تک میں مکمل طور پر دوسروں پر ڈیپنڈ کرتا ہوں، مگر کتنی دیر تک؟ ایک وقت تو کایا پلٹنی ہے۔ سب چیزیں ایک جیسی نہیں رہتیں، ہر چیز کی شکل بدلنی ہے۔ اور شاید یہ ایک عجیب اور بڑا غم بھی ہے۔

میرے ارد گرد، میرے ساتھیوں میں جو خوف میں نے سب سے زیادہ دیکھا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ مالی طور پر کمزور ہونے سے ڈرتے ہیں۔ ایک لڑکے کا سب سے بڑا ڈر اور غم یہی ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب ایک لڑکا ایک مخصوص عمر

میں پہنچ جاتا ہے تو وہ بہت ساری طرف سے دبنے لگتا ہے۔ وہ کئی چیزیں کھل کر بیان نہیں کر پاتا اور نہ ہی وہ چیزیں مانگ پاتا ہے، جن کی واقعی اسے ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے کچھ لوگوں کو اس غم میں ڈپریشن کی اس حد تک جاتے دیکھا ہے کہ وہ خودکشی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر وقت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مر جائیں۔ شاید وہ خود کو بوجھ سمجھنے لگتے ہیں، اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ ماں اور باپ بھی انہیں بوجھ ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ ہر وقت کے طعنے، ڈانٹ، مار، خوف، طنز، اور چھوٹوں کی طنزیہ ہنسی ان کے گرد گردش کرتی رہتی ہے، اور آہستہ آہستہ وہ اس دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔

یہ ایک ایسا مقام ہوتا ہے جب انہیں لگنے لگتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں، کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا۔ وہ اپنے اس غم کو مٹانا چاہتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں۔ شاید ان سارے معاملات میں میں تھوڑا خوش قسمت ہوں، مگر میں بھی لڑکا ہوں، اور میں بھی کبھی کبھار ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔ شاید میں اپنے وہ احساسات الفاظ میں بیان بھی نہ کر سکوں، جب مجھے کوئی چیز چاہیے ہوتی ہے، مگر میرے پاس پیسے نہ ہوں، اور مجھے پیسے مانگنے میں بھی شرم آ رہی ہو۔ ایسے میں میں کیا ہی کر سکتا ہوں؟ کچھ بھی نہیں۔

کسی اپنے کی موت کے مناظر بھی آج میری عجیب سوچوں میں شامل تھے۔ شاید ہم ایسا سوچنا نہیں چاہتے، مگر ہمارا دماغ ایسے لمحات بنا کر دکھاتا ہے کہ "اگر ایسا ہو تو کیا ہو گا؟" جیسے میرے بابا کے بعد میرا کیا ہو گا؟ کون میرے ساتھ ہو گا اور کون چھوڑ جائے گا؟ میں نہیں جانتا، مگر ایک بات طے ہے کہ کوئی بھی ہمیشہ کے لیے نہیں رہتا۔ میری ماما کے بعد میرا کیا ہو گا؟ کون اپنا رہے گا اور کون بیگانہ بن جائے گا؟

شاید جب ایک انسان کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو، تو وہ اسی طرح سوچنے لگتا ہے۔ مجھے ان معاملات میں ایک عجیب سا خوف محسوس ہوتا ہے۔ یہ باتیں کچھ عجیب ہیں، اور میرے لیے بھی عجیب ہیں، کیونکہ یہ واقعی عجیب ہیں۔

2025/02/24

"ملک بُرا نہیں، رویے بُرے ہیں"

انسان کی زندگی میں بہت سارے لوگ آتے ہیں۔ شاید کچھ بہت اچھے اور کچھ بہت برے۔ کچھ لوگ آپ کو حوصلہ دینے آتے ہیں، اور کچھ لوگ آپ کا حوصلہ توڑنے آتے ہیں۔ کچھ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے پاس رہیں، مگر انہیں بہت جلد جانا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ہماری زندگی میں بہت برے آتے ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ وہ چلے جائیں، مگر وہ جاتے نہیں۔ کچھ لوگ ہمیں سمجھدار ملتے ہیں اور کچھ بے وقوف، مگر ان سب میں شاید ہم اکیلے رہ جاتے ہیں اور الگ ہوتے ہیں۔ شاید ہماری اچھائی اور برائی کے ملے جلے ایک باغ کی طرح، یا شاید کچھ دکھی لوگ اسے دلدل کہہ دیں۔

خیر، آج میرے ساتھ ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ میں اور میرا لینگویج سینٹر کا دوست شیمل ہاؤس گئے کیونکہ ہم پیپرز دینا چاہتے تھے اور ہمیں کافی وقت سے سیٹ نہیں مل رہی تھی۔ یہ بھی ایک بڑا عجیب معاملہ ہے کہ پہلے تو پڑھنے میں ایک بندہ خجل ہو جاتا ہے، اور پھر پیپرز دینے میں۔ یہ دنیا میں امن کا رونا رونے والے لوگ اس طرف کیوں نہیں دیکھتے کہ ہم جیسے لوگ یہاں بھی پھنسے ہوئے ہیں؟

یہ معاشرہ اتنا بھیانک ہے کہ اگر ایک بندہ تکلیف میں ہو، تو دوسرا اس کی مدد اس سوچ کے ساتھ نہیں کرتا کہ یہ مسئلہ اس کے ساتھ نہیں ہے۔ لوگ بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں، بڑے بڑے لوگ وہاں آتے ہیں، اور دعوت میں

سینکڑوں قسم کے کھانے تیار کر کے، پوری پلیٹیں بھر کر لاکھوں کا کھانا ضائع کر دیتے ہیں۔ مگر پھر یہی لوگ کہتے ہیں کہ عوام بھوکی مر رہی ہے! اس وقت ان کی آنکھوں پر پٹی کیوں بندھی ہوتی ہے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے؟

خیر، لینگویج سینٹر میں ہمیں بہت ادب کے ساتھ صاف انکار کر دیا گیا کہ کوئی سیٹ دستیاب نہیں۔ ہم شیمل ہاؤس گئے، وہاں کچھ سٹوڈنٹس سے ملے جو وہاں پڑھ رہے تھے۔ وہ چاروں بیٹھے ہوئے تھے، ہم ان کے پاس چلے گئے اور ان سے کچھ سوالات کیے کہ آپ لوگوں کو سیٹس کیسے ملتی ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہمیں بھی میل کرنی پڑتی ہے۔ چلو، یہ تو ٹھیک ہے، مگر وہ تو شاید ہمیں حقیر سمجھ رہے تھے۔ انہیں ایسا لگا جیسے ہم کچھ بھی نہیں۔ انہیں کیا علم کہ ہم کون ہیں؟

ایک بات تو ماننی پڑے گی کہ ان کی لینگویج اسپیکنگ اچھی تھی، جو ہماری اتنی اچھی نہیں تھی، مگر ہماری ریڈنگ بہت اچھی تھی۔ خیر، ان کی سب سے بڑی بے وقوفی یہ تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہر طرح کا پروسس بہت آسان ہے۔

مگر شاید انہوں نے ابھی پروسس شروع نہیں کیا تھا، اس لیے انہیں علم نہیں تھا کہ کتنی خجل خواری ہوتی ہے۔ خیر، یہ ساری باتیں ایک بندہ تب ہی کرتا ہے جب وہ خود خجل نہ ہوا ہو اور اسے اس بات کا علم نہ ہو کہ خجل خواری کیسی ہوتی ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، "مجھے بتانا جب یہ کام بغیر خجل خواری کے کر لو!"

دوسری چیز، جس کی وجہ سے میں انہیں جاہل تصور کرتا ہوں، وہ یہ تھی کہ وہ پاکستان میں بیٹھ کر پاکستان کو پسند نہیں کرتے اور اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ کیا کوئی ملک خراب ہوتا ہے؟ ملک بذاتِ خود خراب نہیں ہوتا، لوگ خراب ہوتے ہیں۔ پاکستان بنانے والا اتنا ذہین شخص تھا کہ جس نے بغیر کسی جنگ کے، الفاظ کے بل بوتے پر پورا ملک حاصل کر لیا۔ مانا کہ حالات بہت خراب ہیں، مگر برائی، خرابی پیدا کرنے والوں پر ڈالنی چاہیے، نہ کہ پورے ملک پر۔

یہ ان کی جہالت کی انتہا تھی کہ جس ملک میں وہ رہتے ہیں، جس نے انہیں دشمنوں سے بچایا ہے، جس ملک میں وہ کھاتے ہیں، جس نے انہیں اپنی نیشنلٹی دی ہے، اسی کو برا کہہ رہے ہیں! ان جیسوں کے لیے میں صرف ایک ہی بات کہوں گا:
"جو اپنے کا نہیں بنا، وہ دوسروں کا کیا بنے گا؟"

2025/02/27

"دوست، تحفے اور ٹنڈے کے قصے"

کچھ دن سے مجھے کچھ بھی لکھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اوپر سے، ایک انسان کے ساتھ اتنے سارے معاملات جڑے ہوتے ہیں کہ وہ زیادہ چیزیں یاد بھی نہیں رکھ پاتا۔ آج کل تو ایک انسان اتنا مصروف ہو گیا ہے کہ وہ یہ بھی یاد نہیں رکھ پاتا کہ اس نے صبح کیا کھایا تھا! شاید ہم ایک ایسی دوڑ کا نا چاہتے ہوئے بھی حصہ بن گئے ہیں جس سے نکلنا شاید ناممکن ہے۔
25 تاریخ کو میرے دوست منیب کی سالگرہ تھی، مگر بے چارہ اپنی سالگرہ والے دن ہی حد سے زیادہ ذلیل ہو گیا۔ میں اس دن صبح اٹھا تو مجھے یاد تھا کہ اس کے لیے تحفہ لینا ہے۔ اس کوشش ہم نے رات کو ہی کر دی تھی۔ میں گھر سے جلدی نکلا تا کہ وقت پر ریسٹورنٹ پہنچ جاؤں، مگر میرے جلدی نکلنے کے باوجود بھی میں ہمیشہ کی طرح لیٹ، مگر اکیلا نہیں، وہ سب خود بھی لیٹ، بس منیب کو چھوڑ کر۔ منیب کی بار بار کالز آ رہی تھیں کہ کہاں رہ گئے ہو؟ میں تو تنگ ہی پڑ گیا!
ایک تو مجھے ویسے ہی شاپنگ کرنی نہیں آتی، اوپر سے کالز کی وجہ سے سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ کیا لوں۔ میں نے پوری انار کلی گھوم لی، مگر کچھ سمجھ ہی نہ آیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ شاپنگ کرنا بھی ایک خاص فن ہے، جو سب کو سیکھنا چاہیے! خیر، ایک گھنٹہ ضائع کرنے کے بعد مجھے ایک بڑی مزے کی دکان ملی جہاں پنجاب کے کلچر کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

وہاں کچھ بیگز، ڈریسنگ کا سامان اور بہت کچھ موجود تھا، مگر زیادہ تر چیزیں لڑکیوں کے لیے تھیں، جن کا مجھے کوئی خاص علم نہیں تھا۔

میں نے اپنے دوست کے لیے ایک ہینڈ بیگ لیا اور ایک انگوٹھی، جو اسے چھوٹی نکلی—ہاہاہاہا! اس کے ساتھ، مجھے یاد آیا کہ 27 کو ٹنڈے نے بھی میرے گھر آنا تھا، تو میں نے اس کے لیے بھی گفٹ لینا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے لیے پنجابی کلچر کی چیزیں لوں تاکہ اسے یاد رہے کہ وہ پاکستان آئی تھی۔ میں نے دو ماڈلز لے لیے—ایک شاہی قلعے کا اور دوسرا بادشاہی مسجد کا، کیونکہ وہ ان جگہوں پر جا چکی تھی اور اسے ان کا پتہ تھا۔ وہاں اور بھی بہت سی چیزیں تھیں، مگر میں نے وہ اس لیے نہیں لیں کہ شاید اسے سمجھ ہی نہ آتی کہ وہ کیا ہیں۔

یہ سب خریدنے کے بعد میں ریسٹورنٹ پہنچا، جہاں ہم نے بہت انجوائے کیا۔

26 کو، یعنی کل، میرے ساتھ کوئی اتنا غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا، سوائے اس کے کہ ٹنڈے کے آنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس پر خوب مذاق بنایا گیا، اور مجھے تو ویسے بھی تقریباً ہر وقت کوئی نہ کوئی مذاق کا نشانہ بنا لیتا ہے۔

ٹنڈے بھی کہہ رہی تھی کہ ہر کوئی میرا ہی مذاق بناتا ہے۔ شاید میں صرف اپنے قریبی لوگوں کو ہی ایسا کرنے دیتا ہوں۔ مگر ایک بات طے ہے کہ جب مذاق ہو رہا ہو، تو میں کسی دوسرے بندے کو اپنی حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ میرا مذاق طنز کرنے کے لیے بناتے ہیں، بلکہ وہ بس ایک ہلکا پھلکا ماحول بنانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ اور ایسا بھی نہیں کہ میں ان کا مذاق نہیں بناتا—جب میں بے عزتی کرنے پر آتا ہوں تو واقعی بہت بے عزتی کرتا ہوں!

کبھی کبھی کوئی مجھے تنگ کر رہا ہوتا ہے تو میں غصہ نہیں کرتا، اور کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی بات پر مجھے غصہ آ جاتا ہے اور میں اسے برداشت نہیں کر پاتا۔ ایسا کیوں ہے، یہ میں خود بھی نہیں جانتا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ کون سی بات پر

مجھے غصہ آئے گا اور کون سی بات نظر انداز کر دوں گا۔ مگر میں نے اپنے بارے میں ایک بات نوٹ کی ہے کہ میں ایک خاص قسم کے بندے کی بات پر غصہ نہیں کرتا، اور ایک خاص قسم کے ماحول میں برداشت کر لیتا ہوں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اگر کچھ لوگ کچھ چیزیں کسی اور طرح کے ماحول میں کریں تو مجھے غصہ آجاتا ہے۔ مثال کے طور پر، جب ہم کالج کے دوست گھومنے کا پلان بنا رہے تھے، تو مسئلہ ہفتے اور اتوار میں سے کسی ایک دن کے انتخاب کا تھا۔ مگر ایک دوست نے الگ ہی لیول کی چول ماری کہ بدھ کا دن رکھ لو! مجھے یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی، تو میں نے فوراً کہہ دیا، "بھائی، تم تو الگ ہی لیول کے عجوبے ہو! اپنی ٹانگ ضرور اڑانی ہے کہ پہلے میری توڑو!"

یہ مسئلہ صرف میرے ساتھ نہیں، بلکہ اور بھی بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ انہیں خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انہیں کون سی چیزیں پسند ہیں اور کون سی نہیں۔

کل رات میری وقار بھائی سے کافی لمبی بات چلی تھی۔ میں ایک بندے پر بڑا غصہ تھا، مگر وقار بھائی تو میرے سے بھی زیادہ اس پر غصہ تھے۔ ان جیسے کچھ لوگ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں، اوقات ان کی دو ٹکے کی ہوتی ہے اور لگے ہوتے ہیں ہمیں کمتر دکھانے میں۔

میں نے سوچا تھا کہ اس بندے کو ذلیل کروں گا، جیسے وہ اکثر لوگوں کو کرتا ہے۔ ایک دفعہ اسے بھی سبق سکھانا چاہیے۔ اس لیے میں نے ارادہ بنایا ہے کہ جب بھی وہ کسی قسم کی بے غیرتی کرے گا، میں اسے بہت ذلیل کروں گا۔

یہ ویسے میرے دوست کا واقعہ ہے۔ وہ لوگ سب مل کر کھانے پر گئے، میرا دوست بھی گیا۔ وہاں وہ بے غیرت میرے دوست کے بارے میں ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ "یہ تمہارا نوکر ہے؟ اسے کیوں لائے ہو کھانے پر؟" جب اس نے مجھے یہ بات بتائی تو مجھے بہت غصہ آیا کہ یار، تم کون ہوتے ہو؟ اسے تو برا محسوس ہوا، مجھے بھی بہت ہوا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو شاید میں وہیں اس کی بہت بے عزتی کرتا۔

خیر، صبح میں نے وقار بھائی کو پھر کالز کیں کہ پوچھ سکوں وہ کہاں ہیں، کیونکہ انہوں نے، ڈاکٹر اور ٹنڈے نے آج گھر آنا تھا۔ آج سارا دن بارش ہوتی رہی اور کوئی ایک بجے کے قریب وہ گھر پہنچ گئے۔ میرے گھر والے تو بے حد خوش تھے، بڑا مذاق بنا رہے تھے۔

ایک چیز جو آج میرے ساتھ سب سے زیادہ بری ہوئی، وہ یہ کہ انہوں نے مجھ سے واش روم صاف کروایا۔ جو تب سے ہم نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا جب سے ہم نے گھر بنایا ہے۔ ٹائلز پر سیمنٹ لگا ہوا تھا، ایک ایک ٹائل گھر والوں نے مجھ سے صاف کروائی۔ افسوس، میرے گھر والے میرے سے ایسے کام بھی لیتے ہیں جب ان کا بس چلے۔ میں نے کہا کہ یہ کام آپ لوگ کریں، تو انہوں نے کہا: "یا ہم کھانا بنائیں گے یا پھر واش روم صاف کریں گے۔" اب مجھے تو کھانا بنانا نہیں آتا تھا، تو مجھے وہ کرنا ہی پڑا۔

گھر میں اور بھی واش روم ہیں جو صاف ستھرے ہیں، مگر ہمارا مہمان شاید انہیں استعمال کرنا نہ جانتا ہو، اس لیے ہمیں وہ کموڈ والا صاف کرنا تھا۔ ہاہاہا! خیر، وہ لوگ گھر آئے، کھانے میں ابھی وقت تھا، تو میں انہیں اپنے روم میں لے گیا اور اپنا روم دکھایا۔ میرے روم میں ایک بڑا سا دنیا کا نقشہ لگا ہوا ہے۔

ٹنڈے نے ہم سے کہا، "بتاؤ ہنگری کہاں ہے؟" میں نے یورپ پر ہاتھ سے دائرہ بنایا اور کہا، "یہاں کہیں ہو گا۔" پورے سات منٹ لگ گئے، ہم تینوں کو مل ہی نہیں رہا تھا۔ ٹنڈے نے ڈاکٹر سے کہا، "فیضان، تم تو مجھے مایوس نہ کرو۔" آخر کار ہم نے ڈھونڈ ہی لیا۔

اس کے بعد ہم چھت پر چلے گئے، جہاں تیز ہوا میں ہم نے تصویریں لیں، پھر کھانے کے لیے نیچے آ گئے اور کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم نے پاکستانی سٹائل میں گھر کے باہر کرسیاں لگا کر چائے پی۔ اوپر سے بارش کے بعد ٹھنڈی ہوا، صاف ستھرا ماحول اور چائے! واہ!

اس کے بعد ڈاکٹر اور وقار چلے گئے۔ ہم نے ٹنڈے کو سوسائٹی دکھائی، مگر بالکل تھوڑی سی۔ اسے بائیک پر شاید بیٹھنے سے ڈر لگتا تھا اور گاڑی ہم میں سے کسی کو چلانی آتی بھی نہیں تھی، تو ہم لوگ اسے پیدل ہی لے گئے۔

میں نے سوچا ہوا تھا کہ ٹنڈے کو اکیڈمی لے کر جاؤں گا، کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ پاکستانی ایجوکیشن سسٹم بہت اچھا ہے، جو شاید اس کی بھول تھی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس سسٹم کو پسند نہیں کرتا۔ جب ہم اکیڈمی پہنچے اور پرنسپل سے ملاقات کے بعد کلاسز میں گئے، تو سر نے اپنے خطاب میں بڑے مزاحیہ انداز میں کہا، "یہ ٹنڈے ہیں ہنگری سے، پیشے میں یہ ایک انجینئر ہیں۔ ان کو پاکستانی نظام تعلیم دیکھنے کا شوق تھا۔" ہم نے کہا، "چلو، یہ تو ان کا شوق سرے سے ہی ختم ہو!" اس کے بعد بچوں کے سوالات تھے، جو اسے تھوڑے عجیب لگے۔ بچے بھی عجوبے ہیں، ایسے ہی عجیب عجیب سوال پوچھتے ہیں۔ خیر، سوالات کے بعد سر نے کہا، "ایک دفعہ ان کے لیے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں تاکہ انہیں ہمیشہ یاد رہے کہ یہ پاکستان آئیں تھیں۔"

بعد میں کچھ اور کلاسز میں ہم نے وزٹ کیا اور پھر گھر واپس آ گئے۔ گھر آ کر اور بھی لوگ آ گئے۔ میری بہن بھی گھر آئی ہوئی تھی اور محلے والے بھی سب کمرے میں اس کے گرد آ کر بیٹھ گئے۔ اب کسی کو بھی انگریزی نہیں آتی تھی، سوائے میرے اور میرے بڑے بھائی کے۔ ہر کوئی اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا بڑا بھائی بولا، "اب مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ لوگ اتنا رش کیوں لگاتے ہیں جب بھی کوئی باہر کے ملک والا آتا ہے۔"

اصل میں کچھ عرصہ پہلے ایک امریکی خاتون پاکستان اپنی محبت کے پیچھے کراچی آ گئی۔ اس کی محبت میں گرفتار اسے دیکھ کر ہی بھاگ گیا، لڑکا تو انڈر گراؤنڈ ہو گیا اور پورا کراچی وہ خاتون دیکھنے آ گیا۔ بڑا شوخل لگا تھا کراچی میں۔

خیر، ٹنڈے ایک بہت اچھی خاتون تھی، بہت ہی زیادہ خوش مزاج۔ بابا سے اس کی ملاقات ہوئی، پھر ہم نے لڈو بھی کھیلی۔ اس کے بعد ہم اسے ڈاکٹر کے پاس چھوڑ آئے۔

2025/03/02

"زندگی: ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش"

میں کبھی کبھی بہت زیادہ فرسٹریشن میں ہوتا ہوں۔ کبھی کبھی میں بہت عجیب سوچوں میں چلا جاتا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا ہے کہ شاید میں ان کا سامنا نہیں کر سکوں گا جنہیں میں نے اور طرف لگا دیا ہے، جنہیں میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی تعریف ہو، وہ ایسے لوگوں کو کبھی کھونا نہیں چاہتا۔ مجھے بھی ایسے لوگ چاہییں، شاید بہت زیادہ، مگر مجھے ایسے لوگ راس نہیں آتے۔

میں آج اتنا زیادہ پریشان تھا کہ میرے اندر کا ابال مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں ایسی دنیا میں پھنسا ہوا ہوں، شاید کہ میں نکل پاؤں۔ میں نے اپنی ساری فرسٹریشن ایک کاغذ پر نکالی کیونکہ شاید ایک کاغذ کے پاس انسانوں سے زیادہ برداشت ہوتی ہے، اور وہ بہت بڑا راز دان بھی ہوتا ہے۔ وہ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ بعد میں آپ اسے جلا کر ختم بھی کر دیں، تب بھی وہ انسانوں کی طرح ہم پر ہماری کمزوری کی بوچھاڑ نہیں کرتا۔ میں کبھی کبھی ایسے حالات میں ایسی چیزیں لکھتا ہوں۔

مجھے اکثر یہ سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا ہوں، میں کیا کر رہا ہوں، اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں جو بھی کام شروع کرتا ہوں، وہ الٹا ہو جاتا ہے۔ میں کبھی بھی کسی کو اپنی زندگی کے بارے میں بات نہیں کرنے دیتا کیونکہ یہ چیز مجھے بہت تکلیف دیتی

ہے۔ہاں، میں یہ جانتا ہوں کہ یہ ایک فطری عمل ہے، دنیا کا کوئی بھی انسان اس سے عاجز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جانور بھی پریشان ہوتے ہیں۔

انسان کا حل، انسان کے اپنے پاس ہی ہوتا ہے، دنیا میں کسی شخص کے پاس نہیں۔ میں ایک بات پر یقین رکھتا ہوں کہ انسان کا مسئلہ وہ بندہ تو حل نہیں کر سکتا جسے خود مسئلہ ہو، اور ایسا کوئی نہیں جسے دنیا میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ انسان کو اپنا دماغ خود چلانا آنا چاہیے۔ ہر ایک کی زندگی الگ ہے، ہر ایک کے تجربات الگ ہیں، اس لیے ہر ایک کے مسئلے بھی الگ ہیں۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو ہی پھنسا رکھا ہے۔

انسان کو انسان سے ہی خطرہ ہے۔ مجھے آج ایک ویڈیو ملی، جس میں ایک بڑی مزے کی بات کہی گئی تھی کہ: "دیکھو! دنیا میں انسان ہی ایک ایسی واحد مخلوق ہے جو زمین پر رہنے کے پیسے دے رہی ہے۔ اب ایک منٹ کے لیے سوچو، ہم پیسے کسے دے رہے ہیں؟ انہوں نے کیا یہ زمین بنائی ہے؟ اصل میں ڈاکو کہیں وہی تو نہیں جنہیں ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں؟ کیا یہ ڈاکو کہیں وہی تو نہیں جنہیں ہم اپنا پیشوا بنا کر بیٹھے ہیں؟"

میں تو عجیب ہوں ہی، یہ دنیا بھی بہت عجیب ہے۔ انسان جذبات سے عاجز ہے۔ زندگی کے دن کبھی اچھے آتے ہیں، کبھی برے۔ خوشی کے بھی، غمی کے بھی۔ زندگی اسی ملی جلی چیز کا نام ہے۔

2025/03/08

"آخری نقطے سے پہلا قدم"

کافی دنوں بعد مجھے موقع ملا ہے کہ کچھ لکھوں۔ ایسا ہوتا ہے کہ جب بھی ہم کسی کام کا ارادہ کر لیتے ہیں تو رکاوٹیں آتی رہتی ہیں، مگر اس سے رک نہیں جانا چاہیے۔ جیسے ہی موقع ملے، ضرور وہ کام کرنا چاہیے جو ایک بندہ کر رہا ہوتا ہے۔

ویسے تو میں زندگی کے بہت سارے معاملات میں الجھا ہوا ہوں، اس لیے مختلف خیالات کے باعث میں کنفیوز ہو جاتا ہوں کہ شروع کہاں سے کروں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا میں کام کے لحاظ سے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کام شروع ہی نہیں کر پاتے کیونکہ انہیں سمجھ نہیں آتی کہ کہاں سے آغاز کریں، اور دوسرے وہ لوگ جو کام شروع تو کر لیتے ہیں مگر اسے ختم نہیں کرتے یا وہ کام ختم ہی نہیں ہوتا۔

اس مسئلے کو ختم کرنے کے لیے میں "آخر سے شروع کا سفر" والا اصول اپناتا ہوں۔ یہ میرا اپنا ذاتی اصول ہے، میری اپنی تھیوری ہے۔ ہر کام ایک مقرر وقت پر شروع ہوتا ہے اور پھر ایک مقرر وقت پر ختم ہو جاتا ہے یا لگاتار چلتا رہتا ہے۔ اگر ہم چیزوں کو شروع سے لکھنا شروع کریں گے تو ضرور کنفیوز ہو جائیں گے، مگر اگر ہم چیزوں کو آخر سے لکھنا شروع کریں تو کبھی کنفیوز نہیں ہوں گے۔

جیسے میں ابھی وہ لکھ رہا ہوں جو اس وقت میرے دماغ میں چل رہا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ چیزیں خود بخود میرے ذہن میں آتی جائیں گی کہ کیا ہوا تھا، اور میں انہیں بہتر طور پر بیان کر سکوں گا۔ کیونکہ ہم سب لوگ دنیا کے کوئی بہت ذہین ترین لوگ تو ہیں نہیں، جنہیں سب کچھ حرف بہ حرف یاد رہے، خاص کر میں تو نہیں۔ مجھے تو وہی چیزیں یاد رہتی ہیں جو میرے جذبات کے ساتھ جڑ جائیں، ورنہ میں چیزوں کو بھول جاتا ہوں۔

بھول جانا بھی ایک اچھی بات ہے، ورنہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی اذیت ناک بن جاتی ہیں اور انہیں قابو کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر ایک اور پہلو بھی بہت اہم ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ نہیں بھولنی چاہیے۔ وہ ہمیں ضرور یاد رکھنی چاہیے کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ جنہیں اپنی تاریخ معلوم نہیں ہوتی، وہ اپنی شناخت بھی مکمل نہیں کر سکتے کہ بتا سکیں کہ وہ کون ہیں۔

تاریخ ایک طرح کی جذباتی طاقت ہوتی ہے کہ ہمارے آباءواجداد کون تھے اور کیا کرتے تھے۔ کچھ دن پہلے میں سوچ رہا تھا کہ ہم لوگ زیادہ تر ان سے ہی محبت رکھتے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔ ہاں، اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں، عقل میں بھی یہی صحیح معلوم ہوتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

مثلاً مجھے اپنے پڑدادا کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کیسے انسان تھے، اس لیے مجھے ان سے کوئی جذباتی ہمدردی نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ میرے پڑدادا تھے۔ پھر میں نے ایک شخص کی کتاب پڑھی جو تقریباً ایک ہزار سال پہلے اس دنیا میں تھا۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، بس اس کی کتاب کے ذریعے اسے جانا کہ وہ کون تھا۔ مجھے اس سے جذباتی ہمدردی محسوس ہوگئی کیونکہ میں نے جان لیا کہ وہ کون تھا۔

شاید اسی لیے میں مانتا ہوں کہ ہم صرف اسی سے محبت رکھتے ہیں جسے ہم جانتے ہیں۔

2025/03/11

"جذبات کی شدت اور انسانی فطرت کا امتحان"

ابھی اس وقت رات کے 1 بج رہے ہیں اور مجھے نیند بھی آ رہی ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ کچھ لکھ کر سوؤں کیونکہ زندگی کی مصروفیات ہمیں کئی کاموں سے روک دیتی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں ہسپتال میں ڈاکٹرز کے ساتھ تھا۔ رات ہسپتال میں ہی میں نے رہنا تھا۔ ہم لوگ لڈو لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ ٹائم ختم ہو چکا تھا اور سب بس گھر جانے کی تیاری میں تھے، بس ہمیں چھوڑ کر۔

اچانک دو عورتیں اور ایک آدمی بھاگتے ہوئے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس ایک بچہ تھا جس کو سانس نہیں آ رہا تھا۔ بچہ بہت زیادہ تکلیف میں تھا۔ وہ کافی زیادہ تڑپ بھی رہا تھا۔ اس کو وہاں ہم پیچھے والے روم میں لے گئے اور وہاں پر ڈاکٹرز بھی آ گئے۔ اس بچے کی فوراً جانچ پڑتال کی کہ اس کو کیا مسئلہ ہو رہا ہے۔ شاید اس کے سانس کی نالی کے اندر کچھ پھنس گیا تھا جس کی وجہ سے اس کو سانس نہیں آ رہا تھا اور وہ بچہ کافی زیادہ تڑپ رہا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کی آنکھ کے اندر ٹارچ مار کر دیکھا تو پتہ چلا کہ بچہ اس وقت بے حواس ہے لیکن بچہ کافی زیادہ تڑپ رہا تھا۔ مجھے تو دیکھ کر ایک دفعہ لگا کہ شاید یہ نزاع کی حالت میں ہے کیونکہ جس طریقے کی اس کی کنڈیشن ہو رہی تھی، مگر بچہ زندہ تھا۔

ہم نے ان کو فوراً سرکاری ہسپتال ریفر کر دیا کہ آپ اس کو وہاں پر لے جائیں۔ میں نے ایک چیز نوٹ کی کہ اس بچے کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے جب ہم بھاگے تھے اس وقت ہمارے اٹھنے سے لے کر اس تک پہنچنے تک ہماری کئی ساری گفتگو آپس میں ہو بھی گئی۔ مطلب اتنے کم وقفے کے اندر ہم اتنی ساری باتیں کر سکتے ہیں، یہ میں نے اس دن سیکھا۔ بلکہ اس دن دیکھا اور شاید دیکھنے سے تجربہ زیادہ بڑھتا ہے۔

اس کے علاوہ اس رات ایک اور بھی بڑا ایک خاص قسم کا کیس آیا جو کافی دلچسپ تھا۔ وہ ایک لڑکی کے بارے میں تھا۔ اس کے والدین اچانک آئے ہسپتال میں، تقریباً اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم نے کیمرے سے دیکھ لیا۔ دروازے ویسے ہی ہم نے بند کر دیے ہوئے تھے، مگر کچھ کام کے لیے وہ ہم نے دوبارہ کھولے تو اس وقت وہ میاں بیوی اندر بھاگتے ہوئے آئے۔ وہ میاں بیوی غریب لوگ تھے اور اس کا شوہر رکشہ چلاتا تھا۔

انہوں نے آ کر کچھ رپورٹس ڈاکٹر کو دکھائیں۔ کیونکہ وہ پہلے سے ہی یہاں پر چیک اپ کروا رہے تھے، اس لیے ڈاکٹر کو پہلے سے ہی پتہ تھا کہ کیا کیس وغیرہ ہے۔ ان کی اصل میں ایک بیٹی تھی جو اچانک بے ہوش ہو جاتی تھی۔ شاید کہ وہ

ڈرامے بازی کر رہی تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ رپورٹس کے اندر کچھ بھی نہیں آ رہا تھا، مگر وہ بیٹھے بیٹھے اچانک بے ہوش ہو جاتی تھی پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی اٹھ جاتی تھی۔

رپورٹس میں کچھ نہ آنے کی یہ سیدھی سیدھی دلیل تھی کہ وہ ڈرامے بازی کر رہی تھی۔ اس وقت میں نے ایک بات سوچی کہ آج کل کے بچے ڈرامے بازی آخر کیوں کر رہے ہیں۔ شاید وہ راہِ فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بعض اوقات ایک بچے کو دماغی طور پر اتنا زیادہ ٹارچر کر دیتے ہیں کہ وہ پھر اس طرح کی حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اور اس کا نقصان دونوں طرف ہوتا ہے۔ والدین کو بھی ہوتا ہے اور بچے کو بھی ہوتا ہے۔ بچے کو یہ نقصان ہوتا ہے کہ وہ اپنی قابلیت سے محروم ہو جاتا ہے، اور تعلیم سے بھی ، اور والدین، ایک تو پہلے ہی غریب، کھانے کے لالے پڑے ہوتے ہیں اور وہ انہی بار بار کے ٹیسٹوں میں اجڑ جاتے ہیں۔

میں نے ان کے چہرے پر اپنی بیٹی کے لیے وہ بے بسی دیکھی کہ میں وہ الفاظ میں بیان بھی نہ کر سکوں۔ ڈاکٹرز نے ایک ہی بات کی کہ وہ ڈرامے بازی کر رہی ہے، اس کو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے، مگر ایک باپ اور ماں کی وہ ٹینشن اور یہ شادی والا جو رواج ہے کہ بیٹی کے رشتے آنے نہ بند ہو جائیں۔ مجھے نفرت ہے ایسی چیزوں سے۔

مجھے لگتا ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کو واقعی طور پر سمجھنا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے کو اصل میں سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے ہر چیز کو جذبات کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ ہم دوسروں کے جذبات کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ مطلب اگر ہم کسی سے کوئی بات منوانا چاہتے ہیں تو ہم اسے جذباتی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاید اسی وجہ سے برصغیر کا یہ حصہ بہت زیادہ جذباتی لوگوں اور شدت پسند لوگوں کا ہے۔ کوئی کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتا اور شاید اسی لیے آج ہم اپنے ارد گرد جو بھی چیز دیکھتے ہیں، وہ صرف جذباتیات کے ساتھ ہی جڑی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ وہاں پر کچھ بھی نہیں ہے۔ جذبات ہونا ایک بہت اچھی بات ہے مگر جب جذبات شدید حالت تک پہنچ جائیں تو ہر چیز بظاہر تو بڑی خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر اندر سے کھوکھلی بھوسے کی طرح ہوتی ہے۔

لوگ جذبات میں بہہ کر پتہ نہیں کیا کیا کر لیتے ہیں۔ آج کل تو میں ایک اور چیز سے بھی گزر رہا ہوں۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ جو لوگ مجھے جس طرح کا بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اصل میں میں نہیں ہوتا بلکہ وہ خود ویسے ہوتے ہیں۔

دوستی کے حوالے سے بھی میں نے دیکھا ہے کہ اصل دوست وہی ہوتا ہے جو مشکل وقت میں ساتھ دے اور ایک دوسرے کی خوشیوں اور تکالیف کو سمجھے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کل بہت سے لوگ جذبات کا غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی خودغرضی کو دوستی کا نام دے دیتے ہیں۔

اسی طریقے کی جذباتیات آج کل لوگ ریلیشن شپ کے اندر بھی استعمال کرتے ہیں، جو ایک بہت غلط طریقے سے استعمال ہوتی ہے۔ ایک لڑکا لڑکی کو ٹارچر کرتا ہے، ایک لڑکی لڑکے کو ٹارچر کرتی ہے۔ دماغی طور پر نقصان پہنچانا اور ہراسمنٹ کرنا، یہ اسی طریقے کے جذبات سے ہی ساری چیزیں نکلتی ہیں۔

کچھ دن پہلے میں ایک کیس پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص نے اپنے دوست کو قتل کر دیا۔ اور 17 سال عدالت میں کیس چلنے کے بعد عدالت نے قاتل کو سزائے موت سنا دی۔ جس دن اسے سزائے موت ہونی تھی، اس سے ایک دن پہلے مقتول کی والدہ نے کوٹ کے اندر آ کر اسے معاف کر دیا۔

یہ ایک اسلامی فیملی کا واقعہ تھا اس عورت نے معاف کرتے وقت کہا کہ "میرے بیٹے! مجھے تم سے کوئی نفرت نہیں ہے۔ تم بھی میرے بیٹے کی طرح ہو، مگر تم نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا میری کوک تو اجاڑ دی مگر میں اپنی دوسری بہن کی کوک اجاڑنا نہیں چاہتی اس لیے میں تمہیں دل سے معاف کرتی ہوں"

انسان کو کوئی فیصلے جذباتیات کے اندر آکر نہیں کرنے چاہئیں۔ اس عورت کا پتہ نہیں کتنا بڑا دل ہو گا جس نے اپنے بیٹے کے قاتل کو معاف کر دیا۔ بات کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ آپ کو ہمدرد دل بننا چاہیے اور اگلے بندے کا خیال رکھنا چاہیے۔ جذبات کے اندر اتنا زیادہ نہیں بہہ جانا چاہیے کہ آپ کو پتہ ہی نہ چلے کہ آپ کا کہاں پر نقصان اور کہاں پر فائدہ ہے۔

2025/02/13

"زندگی کے مسائل اور مضبوطی کا سبق"

کچھ دن پہلے میری میرے ایک دوست سے بات ہو رہی تھی وہ کافی پریشان تھا اگر اندر کی بات بتاوں تو وہ مجھے کہہ رہا تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں میں نے اسے سمجھایا جو چیزیں اسے سمجھائی سوچا آپ کو بھی بتاوں مجھے کہتا ہے کہ میں نے سنا ہے کہ ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے میں نے کہا ہنسنے سے کوئی دل مُردہ نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب بندہ ٹینشن میں ہو تو اسے چاہیے کہ ہنسے، اس ہنسی کے ذریعے آپ تھوڑا فریش ہو جاتے ہیں۔ اس سے حاصل یہ ہوتا ہے کہ ٹینشن کی جو فرسٹریشن ہوتی ہے، وہ کم ہو جاتی ہے، نہ کہ ہر وقت بندہ ٹینشن، ٹینشن، ٹینشن لگا کر بیٹھا رہے۔

ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ ٹینشن آتی ہے اور بندہ بڑا پریشان ہو جاتا ہے، لیکن اس کا حل نکالنا چاہیے۔ بندے کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ٹینشن لے کر بندہ اور پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے دل مُردہ ہوتا ہے۔

اس نے ایک بات کی کہ میں ہر وقت بہت مذاق کرتا ہوں جو اچھی چیز نہیں ہے جس پر میں نے کہا باقی یہ جو بات کر رہے ہو کہ ہر وقت مذاق کرنا اچھی بات نہیں ہوتی، یہ صحیح کہہ رہے ہو۔ ہر وقت مذاق کرنا اچھی بات نہیں ہوتی اور ہر وقت

منہ پھیلائے بھی بیٹھے رہنا اچھی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ جس طرح ہمارا نارمل زون ہے، وہ یہ ہے کہ ہم باتوں پر ہنس بھی لیتے ہیں اور چیزیں سمجھ بھی لیتے ہیں۔ میں مانتا ہوں، لیکن جس طرح سے زون چل رہا ہوتا ہے، اسے چلنے دینا چاہیے۔ اس میں کبھی بھی فلیکچوایشن نہیں کرنی چاہیے۔

اس نے کہا کہ میں بہت سارے معاملات سے اکیلا لڑ رہا ہوں اور کسی سے ڈسکس نہیں کر سکتا جس پر میں نے کہا ٹھیک ہے، یار! میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے کچھ معاملات ہیں۔ ہر انسان کے ایسے معاملات ہوتے ہیں جنہیں وہ کسی سے ڈسکس نہیں کر سکتا، نہ اپنوں سے، نہ دوستوں سے، نہ کزنوں سے، نہ بھائیوں سے، نہ ہی والدین سے۔ یہ بالکل نجی معاملات ہوتے ہیں۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں۔ نجی معاملات کا مطلب ہے کہ انہیں صرف اپنے تک محدود رکھا جائے اور ان کا اثر بھی باہر نہ آنے دیا جائے۔ اگر ہرن یہ بتادے کہ میرے پاس کستوری ہے، مگر میری نجی ہے، تو پھر کستوری اس کی نہیں رہتی۔ کستوری بٹ جاتی ہے۔ اس لیے ان معاملات کو بالکل پرائیویٹ رکھا کرو اور ان کا اثر بھی باہر نہ آنے دیا کرو۔ اگر آپ اپنے معاملات کو خود ڈیل کر رہے ہو تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ یہ ڈیلنگ آنی چاہیے اور اچھے وقت کی امید رکھنی چاہیے کہ اچھا وقت آئے گا۔ مگر اس بات کا یقین بھی رکھنا چاہیے کہ جو وقت آپ گزار رہے ہو، وہ سب سے اچھا وقت ہے۔ کیونکہ آنے والا وقت ہمیشہ پہلے کے وقت سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری ترجیحات بدل جاتی ہیں، اس لیے ہم اچھے کی امید رکھتے رہتے ہیں۔ میں نے بڑا مزے کا جملہ پڑھا کہ میں نے ساری عمر اچھے وقت کی امید میں گزار دی، مگر اب مجھے یقین آگیا ہے کہ جو وقت میں نے گزار دیا، وہی اچھا تھا۔ ہر طرح کے مسئلے عارضی ہوتے ہیں۔ ایک وقت مقرر پر آکر ان مسئلوں کی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ اس کی حیثیت اتنی ہوتی ہے کہ آپ اسے یاد کر کے ہنس پڑو گے کہ یار، یہ بھی کوئی مسئلہ تھا۔ جیسے اگر آج آپ بیٹھ کر سوچو کہ بچپن میں میرا بڑا بھائی میرے سے کھلونا

چھین لیتا تھا یا مجھے کھلونے نہیں ملتے تھے، تو اب آپ کو وہی مسئلوں پر ہنستے ہو اسی طرح آنے والے وقت میں آج کے دور کے مسائل بھی آپ کو ہنسی مذاق ہی لگیں گے کہ یار، یہ کیا تھا۔

اللہ پاک آپ کے تمام معاملات کو جلد از جلد حل فرمائے۔ آمین! ان معاملات میں ثابت قدم رہنا بہت ضروری ہے۔ کئی مسائل آتے ہیں زندگی میں، جن میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوگے کہ میں آپ سے چاہتا یہ ہوں کہ اپنی ضدی فطرت کو ختم کر لو۔ جہاں تک مالی معاملات کا تعلق ہے، تو وہ بھی کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب میرے پاس ہوتے ہیں تو میں مدد کر دیتا ہوں اور جب نہیں ہوتے تو معذرت کر لیتا ہوں کیونکہ مجھے بھی اپنے معاملات کو دیکھ کر چلنا ہوتا ہے۔

میں آپ کو ایک مثال سے سمجھانا چاہتا ہوں کہ ایک بندہ ساری عمر ایک آئیڈیل شخصیت کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ جیسے یہ پاکستانی قوم بھی ایسے ہی بیٹھی ہے کہ ایک آئیڈیل بندہ آئے گا، پاکستان کے نظام کو ٹھیک کرے گا، سب کچھ کرے گا اور چلا جائے گا۔

ہم سب نے ایک آئیڈیل شخصیت کا تصور قائم کر رکھا ہے کہ وہ شخصیت آئے گی، ہماری زندگی میں تبدیلی لائے گی اور چلی جائے گی۔ لیکن وہ آئیڈیل شخصیت ہمارے بستر مرگ سے لے کر قبر کی مٹی تک نہیں آتی۔

لہٰذا اس آئیڈیل شخصیت کے انتظار کے بجائے ہمیں خود ہی اپنے مسائل کا حل نکالنا چاہیے۔ کیونکہ وہ آئیڈیل شخصیت اصل میں موجود ہی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں کی زندگیوں میں شاید آتی ہو، لیکن عمومی طور پر اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

اپنے برے وقت کو اچھا بنانے کی کوشش کرو، نہ کہ برے وقت پر رونا شروع کر دو۔ ہاں، ٹھیک ہے، کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے، یہ ایک فطری عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو آپ ذہنی طور پر بیمار کہلاؤ گے۔

یہ فطرت کا عمل ہے اور فطرت کی چیزیں کبھی بدل نہیں سکتیں۔ فطرت ہر انسان کو چھوتی ہے اور اسے اس طریقے سے پریشان بھی کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ مستقل معاملہ بن جائے تو آپ ذہنی مریض قرار دیے جاسکتے ہیں۔ باقی آپ پریشان مت ہوں، معاملات حل ہو جائیں گے۔

2025/03/29

"اگر جیناہی ہے تو مسکرا کا جینا بہتر ہے"

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ آپ کی زندگی میں آتے ہیں۔ منہ سے تو شریف ہوتے ہیں، مگر ان پر یقین کرنا بے وقوفی ہوتی ہے۔ وہ پہلے ایک بندے کو آخری حد تک تنگ کر کے کہتے ہیں، "ہم تو مذاق کر رہے تھے۔" بھلا یہ کیسا مذاق ہے؟

میری ایک بڑی عجیب عادت ہے۔ میں لوگوں کو انجوائے کروانے کے لیے ان سے ریکویسٹ کر رہا ہوتا ہوں، پتہ نہیں کیوں؟ حالانکہ انجوائے انہیں کرنا ہے، پھر بھی سب کچھ مجھے ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ کیوں دکھی رہنا چاہتے ہیں؟ ہر وقت خودکشی کرنے کی باتیں کرتے ہیں، یہ بولتے ہیں کہ "ہم بڑے دکھی ہیں، ہمیں یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔"

میرا اندر سے تو دل کرتا ہے کہ بولوں، "جایار! جا کر کرلے خودکشی، ایک دفعہ ذرا ہمت تو کر!" مگر خودکشی کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ پھر کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ میں اسے بول دوں، "جا، جا کر کرلے۔" لیکن کہیں وہ سچ میں نہ کرلے! کیونکہ کچھ لوگ واقعی بہت دکھی ہوتے ہیں۔ مگر ان سے بھی مجھے گلہ ہے کہ خودکشی کرنے سے آخر کیا فائدہ ہو گا؟

یہ تو بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں، ورنہ بڑی تعداد میں لوگ تو بس بکواس ہی کر رہے ہوتے ہیں کہ "ہم نے مر جانا ہے!" بھائی، مجھے ایک بات بتاؤ، تمہارے جانے سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟ یا دنیا کو کیا نقصان ہو گا؟ کچھ بھی نہیں، کسی کو فرق تک نہیں پڑے گا۔ تو اگر کسی کو تمہارے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، تو تم کیوں کسی کی پروا کر رہے ہو؟ ان معاملات میں میرا ماننا ہے کہ اگر تمہیں ڈر ہے کہ تم نے مرنا ہی ہے، تو اگلے کو بھی تباہ کر کے مرو، تاکہ تمہیں مرنے کے بعد اس بات کا افسوس نہ رہے۔

خیر، میں نے ایک جملہ سنا:

"کہ زندگی میں مشکلیں تمام ہیں
پھر بھی ان ہونٹوں پر مسکان ہے
اگر جینا ہی ہے ہر حال میں
تو مسکرا کر جینے میں کیا نقصان ہے؟"

اگر جینا چاہتے ہو تو مسکرا کر، شان سے جینا سیکھو۔ خوشیاں خود نہیں آتیں، خود بنانی پڑتی ہیں۔ پھر اگر مرنا ہے، تو شان سے مرو، تاکہ ایک دفعہ زمانہ یاد رکھے کہ کوئی مرا تھا! یوں بیماریوں میں گھر کر مرنا بھی کوئی مرنا ہے؟

میں نہیں سمجھتا کہ اس شخص سے زیادہ کوئی دکھی ہو سکتا ہے جو سات دنوں سے بھوکا ہو اور اس کا اپنا، اس کے سامنے تڑپ کر مر رہا ہو، اور وہ بے بس ہو، کچھ نہ کر پا رہا ہو۔ ذرا اس بندے سے تکلیف پوچھو جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو، سوائے اس کے سب سے پیارے کے، اور وہ اس کے سامنے مر جائے۔

یا اس ماں سے پوچھو جس کا اکلوتا بیٹا اس کے سامنے دم توڑ دے۔ اس بہن سے اس کا غم پوچھو جس کا دنیا میں اس کا اکیلا بھائی ہو اور وہ گم ہو جائے۔ اگر زندگی کی قیمت جاننی ہے، تو اس بندے سے پوچھو جسے ڈاکٹر یہ کہہ چکے ہوں کہ "تم بس دو دنوں کے مہمان ہو!"

ذرا سوچو، اگر تمہیں آج معلوم ہو جائے کہ کل تم نے مر جانا ہے، تو تم آج کا دن کیسے گزارو گے؟ ویسے ہی جیسے تم گزارنا چاہتے ہو! پھر اگر تمہیں آج یہ بھی نہیں معلوم کہ اگلے لمحے تم رہو گے بھی یا نہیں، تو تم آج وہ کیوں نہیں کر رہے جو کرنا چاہتے ہو؟

دکھ اس بات کا نہیں کہ بندہ مر جائے، دکھ اس بات کا ہے کہ ایک بندہ ہاتھ میں پانی کا پیالہ لیے پیاسا مر جائے! زندگی جیو، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جیو اپنے لیے، کیونکہ کسی نے تمہارے لیے نہیں جینا۔ اپنے لیے جیو، دوسروں کو سہارا دو، مدد کرو، مگر اپنے لیے جیو اپنے لیے مرو!

خدا نے کسی کے ساتھ بھی بے انصافی نہیں کی۔ اس نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے، سب کو اسی نطفے سے تخلیق کیا جو مرد سے اچھل کر نکلتا ہے، یعنی اس گندی چیز سے، جس کے نکلنے سے بندے کو نہانا پڑ جاتا ہے۔ تو کبھی بھی کسی کو اونچا نہ سمجھو، کسی کو نیچا نہ سمجھو، سب برابر ہیں!

2025/04/10

"ہم پر ظلم اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ہم ہونے دیتے ہیں"

خود کو بدلنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پانی پی کر زندہ رہنا۔ اگر میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہو تو میں کیا کروں؟ اپنے ساتھ وہ ظلم ہونے دوں یا میں اس کا منہ توڑ جواب دوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ طاقت ہونا بہت ضروری ہے۔

اگر آپ کے پاس طاقت نہیں تو ہر ایرا غیرا آپ پر کیچڑ اچھالے گا، اپنا مزا پورا کرے گا اور نکل جائے گا۔ اور اگر ہم یوں ہی بیٹھے رہیں گئے کہ پولیس آئے گی، یہ ہو گا، وہ ہو گا، تو ہم کچھ کر سکیں گے؟ تو ایسا کبھی نہ ہونا۔ اگر آپ کو کوئی ایک تھپڑ مارتا ہے، آپ بھی آگے سے اسی وقت مار دو، کیونکہ بعد میں وہ تھپڑ کسی کھاتے میں نہیں جانا۔ اور اگر ہر چیز اللہ پر چھوڑ دی جائے گئی تو ایسے ہی ہجوم اکٹھا ہوتا رہے گا، ظلم ہوتا رہے گا، اور انسان مذاق بنتا رہے گا۔

اگر کوئی شخص میرا مذاق بنا رہا ہے تو میں کیوں چپ رہوں؟ اگر اسے ڈر نہیں تو میں کیوں ڈر رہا ہوں؟ کیا مجھے ڈر کر موت نہیں آئے گی؟ موت نے اپنی اسی اذیت کے ساتھ آنا ہے جیسے وہ آئے گی۔ لہٰذا زندگی موت کے ڈر سے ضائع کرنا کوئی سمجھداری نہیں۔ زندگی اونچا ہو کر جیو، پتا نہیں کب کس نے مر جانا ہے۔

میں کبھی اجازت نہیں دوں گا کہ کوئی میرے ساتھ بکواس کرے۔ میں تو لڑنا پسند کروں گا، جو ہو گا بعد میں دیکھا جائے گا۔ جتنی دیر ہم نے کسی کے بھروسے انصاف کا انتظار کرنا ہے، وہ کبھی نہیں ہونا۔ خود آؤ اور اپنا منصف بن کر انصاف کرو۔ اگر تم بیٹھے رہو گے تو بیٹھے رہ جاؤ گے۔ آج اٹھ جاؤ، ورنہ یاد رکھنا بہت سے لوگ آئے اور چلے گئے۔ ہمیں ہر چیز میں تب ہوش آتی ہے جب چیزیں ہم خود پر پڑتی ہیں۔ اگر زندگی ایسی جینا چاہتے ہو کہ کوئی تکلیف نہ ہو، تو ایسی زندگی کبھی نہیں ملنی۔

تکلیف ہر جگہ ہے، تو اس تکلیف سے ڈرنے سے بہتر ہے کہ لڑ کر جیت جاؤ۔ اگر انصاف آپ کو نہیں مل رہا تو انصاف کا انتظار کرنے کی بجائے آج خود منصف بن جاؤ۔ آج اگر تم ہمت کرو گے تو آگے سے کسی دوسرے کی ہمت نہیں ہو گی کہ ایسا دوبارہ ہو۔ فتنے کے دور میں امن کا والی بن کر بیٹھے رہنا سمجھداری نہیں، بے وقوفی ہے۔

ایک بات بتاؤں؟ ہم پر ظلم اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ہم ہونے دیتے ہیں۔

2025/04/21

آج کا دن کچھ عجیب سا ہے، موسم کی سمجھ نہیں آ رہی۔ کبھی دھوپ آ جاتی ہے، کبھی چھاؤں۔

ایسا ہی میرا بھی آج کا دن ہے۔ صبح سے مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا۔ ایک جملہ جس نے صبح سے میرا موڈ خراب کیا ہوا ہے کہ میری ایک اسٹوڈنٹ مجھے کہتی ہے کہ میں آپ کو کسی کالج کا پروفیسر سمجھتی تھی، مگر آپ تو فارمیسی پر ٹائپنگ کرنے والے ہیں۔ حالانکہ میں نہ تو پروفیسر ہوں اور نہ ہی کوئی ٹائپنگ کرنے والا۔ میں ہسپتال سے منسلک ضرور ہوں اور اکثر وہاں جاتا ہوں، مگر میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔ اور اس نے مجھے کیسے اور کہاں دیکھ لیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔

مجھے اس بات کا غم نہیں ہے کہ وہ مجھے کسی چھوٹے پیشے سے منسلک کر رہی ہے، اور نہ ہی میں اس پیشے کو چھوٹا سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بندہ اگر اس پیشے سے محنت کر کے کما رہا ہے تو اس میں برائی ہی کیا ہے۔ میں نہ تو انسانوں میں فرق کو مانتا ہوں اور نہ ہی پیشے میں۔ بلکہ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ ان کی طرح کے لوگ چھوٹی سوچ کے مالک ہوتے ہیں اور کسی کے پیشے سے اس کی بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ حالانکہ میں بہت شاہانہ زندگی گزار رہا ہوں، جو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مگر مجھے کیا ہی ضرورت پڑی ہے ان کو یہ بات ثابت کرنے کی کہ میں کون ہوں؟ حالانکہ اگر وہ میری بات نہیں بھی مانتے تو نہ مانیں، میرا کون سا کوئی نقصان ہے؟ نقصان تو اُلٹا ان کا ہی ہے۔

کبھی کبھی انسان کو وہ بننا پڑتا ہے جو وہ نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے ہی آج لوگوں کے دو نہیں، ہزاروں چہرے ہیں۔ وہ ہر ایک کے لیے الگ چہرہ رکھتے ہیں۔ اگر معاملات کو اس نظریے سے دیکھا جائے تو ان کو یہ بننے پر ہم اچھے لوگوں نے ہی مجبور کیا ہے۔ اور اگر ہم نے مجبور کیا ہے تو ہم اچھے کیسے ہیں؟

کبھی کبھی مجھے لگنے لگتا ہے کہ واقعی "برا" ہونا بھی بہت ضروری ہے، کیونکہ آج کے اچھے لوگ کسی کو اس کی اصل میں رہنے نہیں دیتے۔ طعنے اور باتیں کرتے ہیں، مگر آخر میں خود ہی اچھے رہتے ہیں، اور اپنی باتوں میں اگلے کو اتنا برا بنا دیتے ہیں کہ جس کی حد نہیں۔

ہمیں کسی کے بارے میں رائے دینے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہماری رائے کسی کو کیا بننے پر مجبور کر دے، ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

میں اپنے بارے میں بھی کبھی کبھی حیران رہ جاتا ہوں کہ میں وہ کیوں نہیں رہ پاتا جو میں ہوتا ہوں۔ مثلاً اگر ایک شخص مجھے اچھا کہہ رہا ہے، تو میں خود بخود اس کے سامنے اچھے کام کرنا شروع کر دوں گا، حالانکہ میری کوئی انٹینشن بھی نہیں ہو گی۔ اور اگر ایک شخص مجھے برا تصور کر رہا ہے، تو خود بخود میرے اس کے سامنے سارے کام اُلٹے ہوں جائیں گے۔

پہلے تو میں چاہتا ہوتا تھا کہ مجھے پتا چلے کہ کون میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، مگر اب میں ایسا نہیں کرتا، کیونکہ مجھے لوگوں کی رائے جان کر اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر میں اندر ہی اندر اس سے نفرت رکھنا شروع کر دیتا ہوں۔

اس بات کو لے کر میری میرے دوست سے بھی لڑائی ہو چکی ہے۔ وہ مجھے برا برا کہتا رہتا تھا۔ اس کو لگتا تھا کہ میں اس کے لیے مسئلوں کی وجہ ہوں۔ تو میں نے کہا: بھائی، اگر مسئلے میری وجہ سے ہیں تو جاؤ بھائی، آج سے میں تمہیں نہیں بلاتا۔ پھر وہ مجھے منانے لگا، مگر میں کیوں مانوں؟ اگر مسئلے ہیں تو ختم بہتر ہے، بنسبت اس کے کہ وہ اپنے لیے مسئلے بھی برداشت کرے اور مجھے برا بھی سمجھے، اور میں اپنی نظروں میں گر جاؤں۔

مگر اب کیونکہ اس نے منانا چاہا ہے، تو وہ اچھا بن گیا ہے۔ کیوں؟ اگر میں وجہ بتاؤں کہ میں کیوں نہیں ماننا چاہتا تو پھر بھی میں ہی برا کہلاؤں گا، کیونکہ یہ بات راز تھی کہ وہ میرے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور اس کے والد کیا رکھتے ہیں۔

اب راز فاش ہوا تو بھی برا، اور نہ مانا تو بھی برا۔ اور اگر مانا، پھر بھی برا۔ تو اگر میں نے ایسا "برا" ہی رہنا ہے، تو میں بہتر سمجھتا ہوں ایسا برا بنوں جو کم از کم کسی کے لیے مسئلے کا باعث تو نہ ہو۔

میں کیوں اس چیز کو ٹھیک کروں جو میں نے خراب کی ہی نہیں؟ میں کیوں اس شخص کو مناؤں جسے میں نے ناراض کیا ہی نہیں؟

بس ان ساری باتوں کی وجہ سے میں لوگوں سے غصہ ہو جاتا ہوں۔ اور وہ اسٹوڈنٹ جس کی بات نے مجھے صبح سے ہی تنگ کیا ہوا ہے، اس کی وجہ سے میرا دل کر رہا ہے کہ باقی اسٹوڈنٹ کی بھی مدد نہ کروں۔ اگر ہم کسی کی مفت میں مدد کرتے ہیں تو ایسے نتیجے بھی آتے ہیں۔

مگر پھر سوچتا ہوں کہ یار، ایک کی وجہ سے باقیوں کی تو مدد نہیں روکنی چاہیے۔ مگر میں نے ایک بات نوٹ کی ہے: جو پیسے لے کر پڑھاتا ہے، اس کی عزت یہ لوگ زیادہ کرتے ہیں، اور جو صرف خدا کے لیے مدد کرتا ہے، مفت پڑھا دیتا ہے، ان کی یہ ذرا سی بھی عزت نہیں کرتے۔

خیر، ساری باتوں کی ایک بات ہے: میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کبھی بھی اس چیز کو ٹھیک کرنے کی ضرورت نہیں جو آپ نے خراب نہیں کی۔

2025/4/28

اکڑ کر رہنا بھی بہت ضروری ہے

میں نے ایک بات آج سیکھی ہے کہ ہماری زندگی میں حسرت صرف اس چیز کی ہوتی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے یا اس چیز کی جس کو ہم کھو دیتے ہیں۔ جب ایک چیز ہمارے پاس ہوتی ہے یا ہم اسے حاصل کر لیتے ہیں تو اس چیز کی وقعت وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ ہر انسان وہ کیوں بننا چاہتا ہے جو وہ نہیں ہے؟ وہ کیوں اس چیز پر خوش نہیں ہوتا جو وہ ہے؟ میں بھی کوئی الگ نہیں ہوں، میں بھی ایسا ہی ہوں۔ میں کبھی کبھی خود بھی پریشان ہو جاتا ہوں کہ یار، میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ میں آج سارا دن یہی غور کرتا رہا۔ اب دیکھو کتنی عجیب بات ہے: آج میں نے اپنے ایک اسٹوڈنٹ کو اپنے سے ملنے کی اجازت دے دی، حالانکہ اسے اجازت میں نے دی، اسے فری میں سمجھانا، میرا ہی دماغ کھپانا، اوپر سے اسے اپنے گھر آنے دینا اور کھانا بھی کھلانا۔ مگر پھر بھی خوشی اس کی نسبت مجھے تھی، اتنی زیادہ کہ میں پوری رات سو ہی نہیں سکا۔ کتنا عجیب ہوں میں!

اور پھر وہ نہیں آیا۔ مجھے ایک وقت کے لیے خود پر غصہ بہت زیادہ آیا کہ میں ایسا کیوں بنتا جا رہا ہوں؟ میں کیوں کسی کو اپنے گھر بلاتا ہوں اور کیوں وہ میرے گھر آنے سے ڈرتے ہیں؟ آخر کیوں؟

اور بات یہی ختم نہیں ہوتی، کبھی کبھی لوگ مجھے ایسے اگنور کر رہے ہوتے ہیں جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہیں، اور کبھی کبھی میرے سے ایسے پیش آتے ہیں کہ جیسے ان کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور ہے ہی نہیں۔

میرا ایک دوست آج گھر آیا، ویسے میں اسے پسند کرتا ہوں، مگر اگر شاید کوئی دوسرا شخص اسے دیکھے تو اسے نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھے گا کیونکہ اس کے ہونٹ پان کھانے کی وجہ سے عجیب ہو چکے ہیں، اور دانت کالے اور سرخ ہیں، اور وہ بدمعاش ہے۔ میں اسے اس کے کانفیڈنس کی وجہ سے پسند کرتا ہوں، حالانکہ میں کبھی بات کرنے میں جھجک محسوس

نہیں کرتا۔ میں کسی سے بھی جا کر بات کر لیتا ہوں، مگر جب بات پیسوں کی آ جاتی ہے تو میں نہیں کر پاتا، اور وہ بغیر جھجک کے ہر ایک سے یہ والی بات بھی کر لیتا ہے۔ اور میں کسی آوارہ سے بحث کرنے میں خوف محسوس کرتا ہوں، کیونکہ وہ خود تو گندہ ہوا ہوتا ہے، مجھے بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے میں ایسے لوگوں سے بات نہیں کرتا، سوائے تب جب میرے ساتھ میرا کوئی ساتھی ہو۔

اور مجھ میں پیسے خرچ کرنے کا بھی خوف ہے۔ میں اکیلا کبھی بھی پیسے خرچ نہیں کرتا، سوچتا رہتا ہوں۔ اور میں کبھی بھی اپنے پاس پیسے نہیں رکھ پاتا۔ جیسے ہی میرے پاس پیسے آتے ہیں، میں فوراً ادھر ادھر دے دیتا ہوں، جو میری ایک بہت بری عادت ہے، جس کے بارے میں میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مجھے پیسے سنبھالنے کا طریقہ سیکھنا چاہیے۔

یہ ساری چیزیں مجھے بہت زیادہ پریشان کرتی ہیں اور مجھے تکلیف دیتی ہیں۔

کچھ مقام ایسے ہوتے ہیں کہ میں "نہ" کرنے میں ڈر رہا ہوتا ہوں، اور اگر کر دوں تو میں خود ہی شرمندہ ہونے لگ جاتا ہوں۔ یہ ساری چیزوں کا تعلق دل کے ساتھ ہے یا دماغ کے ساتھ، مجھے نہیں پتا۔ اور ایک اور چیز جو میرے ساتھ ہو رہی ہے: آج کل چھوٹے چھوٹے خوف پر میرا دل میرے قابو سے باہر ہو جاتا ہے، اور وہ اتنا تیز دھڑکنے لگ جاتا ہے کہ جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔

اور ایسا کیوں ہو رہا ہے، مجھے سمجھ نہیں آ رہا، حالانکہ پہلے کبھی میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ابھی شروع ہونا شروع ہوا ہے۔

بابا اکثر کہتے ہیں کہ ڈرتے وہ ہیں جو غلط کرتے ہیں، اور میں بغیر کچھ غلط کیے اندر ہی اندر ڈر جاتا ہوں۔

مجھے یہ بات محسوس کروائی جاتی ہے جیسے میں غلط کر رہا ہوں، حالانکہ میں جانتا ہوتا ہوں کہ میں غلط نہیں کر رہا۔ شاید یہی وجہ ہے۔

ساری باتوں کا لب لباب یہی مجھے سمجھ آتا ہے کہ میں ویسے ہی رہوں جیسے میں اکڑ کر ہو جاتا ہوں۔ میرا دل میرے قابو میں نہیں، تو کوئی مسئلہ نہیں، جسم میرے قابو میں ہے۔ میں اکڑ سکتا ہوں، اور میں یہی کرتا ہوں۔

اسی لیے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ اکڑ کر رہنا بھی بہت ضروری ہے۔

2025/5/5

آج میں نے خوف اور تکلیف میں فرق سیکھ لیا ہے۔

اس دنیا میں انسان کو اپنے مرنے کا خوف ہوتا ہے اور اپنے قریبی کے مرنے کی تکلیف۔

موت ایک ایسی چیز ہے جس نے ہر مخلوق کو ایک دن ملنے آنا ہے، اور موت ایک ایسا ساتھی ہے جس سے ہمیشہ سب نے ہارنا ہی ہے۔

موت سے کوئی جیت نہیں سکتا، اور موت سے زیادہ تکلیف دہ چیز بے بسی ہے۔

ایسی بے بسی جس کو بیان بھی نہ کیا جا سکتا ہو، جب کوئی اپنا اپنے سامنے مر رہا ہو اور ہم کچھ نہ کر پا رہے ہوں۔

کیا محسوس ہوتا ہے جب کوئی ایسا مر رہا ہو جس کے ساتھ آپ نے اپنی زندگی کے کئی سال گزارے ہوں؟

میرا ایک دوست، سب سے پرانا دوست، جو مجھے یاد آتا ہے کہ اس سے پرانا میرا اسکول کا کوئی دوست نہیں ہے۔

کل رات مجھے پتا چلا کہ وہ کومے میں ہے۔

پورے ایک سال سے اس سے ہم میں سے کسی کا کنٹیکٹ نہیں ہو رہا تھا، ہم میں سے کسی کو یہ نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔

مجھے صرف اس کے علاقے کا پتا تھا، مگر اس کا کوئی آتا پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

نہ وہ ہماری کال اٹھاتا تھا اور نہ میسج کا ریپلائے کرتا تھا۔

اس کے بھائی کا نمبر پتا کروا کر میں نے اس سے کئی دفعہ کنٹیکٹ کرنے کی کوشش کی، مگر کنٹیکٹ نہیں ہو سکا۔

کل رات میں ایک فنکشن میں گیا۔

میں کبھی اس فنکشن میں نہ جاتا کیونکہ میں بہت زیادہ تھکا ہوا تھا، اتنا زیادہ کہ تھکاوٹ کی وجہ سے مجھے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

کل میں اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔

بابا نے مجھے کہا، "چلو، میرے ساتھ چلو۔"

پہلے تو میں نے منع کر دیا، مگر پھر میں تیار ہو گیا۔

فنکشن کے اندر بابا چیف گیسٹ تھے، مگر میں اکثر کچھ فنکشنز پر عام بندہ بن کر بیٹھنا پسند کرتا ہوں۔

میں نے کپڑے بھی گندے سے ہی پہنے تھے، اور میں وہاں عام عوام میں جا کر بیٹھ گیا۔

لوگوں میں سے کسی کو بھی میرا نہیں پتا تھا، اور وہ مجھے ایسے ٹریٹ کر رہے تھے کہ پتا نہیں میں کتنا کوئی۔۔۔

کبھی یہاں سے مجھے دھکا پڑ رہا ہے، کبھی وہاں سے۔

میں دھکے سے بچنے کے لیے تھوڑا سا آگے آ گیا۔

میں وہاں کھڑا تھا کہ اچانک میری نظر میرے دوست فائیک کے بھائی پر پڑ گئی کیونکہ فنکشن کی مینجمنٹ مجھے پہچانتی تھی تو میں وہاں سے گزر کر اس کے بھائی کے پاس چلا گیا۔

وہ مجھے اچھے سے جانتا پہچانتا تھا۔

اس سے جاتے ساتھ میرا پہلا سوال تھا کہ "فائیک کال کیوں نہیں اٹھاتا؟"

اس نے مجھے کہا کہ وہ بیمار ہے۔

میں نے پوچھا، "وہ کہاں ہے ؟"

اس نے کہا، "گھر ہے۔"

مجھے تھوڑا اندر سے غصہ آیا کہ چلو، بندہ بیمار ہو ہی جاتا ہے، مگر بیمار ہونے کا کنٹیکٹ نہ کرنے سے کیا تعلق ہے ؟

ہمارا تو ایک سال سے کنٹیکٹ نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا، "کیا ہوا ہے ؟"

اس نے بتایا، "تمہیں نہیں پتا؟"

میں نے کہا، "کیا نہیں پتا؟"

اس نے کہا، "وہ تو کومے میں ہے، ڈاکٹر نے تو اسے ایک سال کا وقت دیا ہے۔"

یہ سنتے ہی ایک منٹ کے لیے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

2025/08/23

کافی عرصے بعد توفیق ملی ہے کچھ لکھنے کی۔

میں نے ایک حساب لگایا کہ جب تک اچھے لوگ برے نہیں بنیں گے اور جب تک وہ یہ نہیں سمجھیں گے کہ برا بننا کیوں ضروری ہے، تب تک اچھے لوگ ذلیل ہی ہوتے رہیں گے۔

میں مانتا ہوں دنیا میں برا بننا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اچھا بننا ضروری ہے۔ میں نے کسی برے پر الزام لگتے نہیں دیکھا اور کسی اچھے کو بغیر الزام نہیں دیکھا۔

اور کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جو نہیں بھلائے جاتے، کچھ زخم انسان نہیں بھول سکتا۔ میں اپنی ہی ایک بات کرتا ہوں، وہ کچھ دن پہلے ہی میرے ساتھ ہوئی۔ شاید وہ کسی کے لیے تو بڑی بات نہ ہو، مگر ضروری نہیں جس چیز کو آپ چھوٹا سمجھتے ہیں، وہ کسی دوسرے کے لیے بھی چھوٹی ہو۔ مثلاً کچھ لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کے لیے ایک ہزار روپے معنی نہیں رکھتے ہوں گے، مگر ایک مزدور کے لیے ایک ہزار روپے بڑے معنی رکھتے ہیں۔ آنے والے زمانے کے لوگ شاید اگر اس کتاب کو پڑھیں تو تب کرنسی کی ویلیو بدل جائے۔ جیسے ہم محسوس کرتے ہیں، وہ بھی کریں۔

اچھا خیر۔

یہ بات ہے 19 اگست کی۔ میں اپنے ادارے میں گیا۔ میرا جانے کا تو کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میرے پاس ایک ایکسٹرا پیزا تھا۔ اب یا تو وہ میں گھر لاتا یا ادارے میں جا کر ہم سب مل کر کھا لیتے۔ خیر، میں نے سوچا ادارے میں پوچھ لیتا ہوں، اگر نہیں تو گھر لے جاؤں گا۔

میں نے مس کو کال کی۔ انہوں نے کہا: ”آ جاؤ، چائے کے ساتھ کھائیں گے۔“ میں 4:13 پر ادارے میں داخل ہوا۔ ہم نے کھایا اور باتیں کیں۔ پڑھنے کا تو دور دور تک ارادہ نہیں تھا۔ باتیں وغیرہ کر کے میں 5:08 پر ادارے سے دوست کے ساتھ نکل گیا۔ مجھے کچھ تحفے لینے تھے۔

اگلے دن بابا کی سالگرہ تھی مگر وہ یہاں نہیں تھے۔ خیر، ادارہ جانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے چھٹی مار لی۔

شام کے وقت منیب کی کال آئی مگر مجھے نہیں پتا چلا۔ میں نے بعد میں اسے کال کی۔ اس نے کہا: ”میں کچھ دیر تک کال کرتا ہوں تو اٹھانا۔“ میں نے کہا: ”ٹھیک ہے۔“

خیر، میں نے بعد میں فون چارجر پر لگا دیا اور بھول گیا۔ پھر میں نیچے امی کے پاس آ گیا۔ ہم سارے باتیں کر رہے تھے۔

کوئی گھنٹے بعد میں نے موبائل آن کیا تو اس کی کال آئی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً کال کی۔ وہ مذاق میں کہتا: ”نہیں نہیں، تونے جان بوجھ کر نہیں اٹھائی۔“ خیر شغل وغیرہ کے بعد اس نے کہا: ”معیظ! ایک بات پوچھنی ہے، شک کی بنیاد پر نہیں، ویسے کلئیر کرنے کے لیے۔“ میں نے کہا: ”بھائی آپ شک کی بنیاد پر پوچھ لو، کوئی مسئلہ نہیں۔“ کہتا: ”معیظ! جو لڑکی ادارے میں آتی ہے، آپ نے اس کی تصویر لی ہے؟“ میں نے کہا: کون سی لڑکی کہتا وہ جو مجھ پر لائن کرواتی ہے آمنہ۔ میں نے کہا ”نہیں۔“ کہتا بس یہی پوچھنا تھا۔ میں نے کہا کیوں کیا ہوا ہے؟

پھر اس نے مجھے بتایا کہ آج وہ سیڑھیوں سے اوپر آنے لگا، تو وہ لڑکی اس کے پاس آئی، آواز دے کر روکا اور کہنے لگی: ”آپ لوگوں نے کل میری تصویر لی تھی۔“ اس نے کہا: ”میری بہن! ہم نے نہیں لی۔“ کہتی: ”نہیں، آپ نے نہیں، آپ کے دوست نے لی ہے۔ اس کو سمجھاؤ۔“ اس نے کہا: ”نہیں، اس نے بھی نہیں لی۔“ کہتی: ”میرے پاس ثبوت ہے۔“ وہ کہتا ہے: ”میں اس سے جان چھڑوا کر اوپر آیا اور پہلے سوچ میں پڑ گیا کہ یار، مس کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔“ پھر اس نے سوچا کہ بعد میں معاملہ خراب ہو گا، بتا دیتا ہوں۔

اس نے بتایا کہ مس نے چھٹی کے وقت اس لڑکی کو بلایا اور کہا: ”آپ نے کہا ہے اس لڑکے نے ایسا کیا ہے؟“ کہتی: ”ہاں مس۔“ مس کہتی ہیں: ”میں 110 فیصد گارنٹی دیتی ہوں اس نے ایسا نہیں کیا ہو گا۔“ کہتی: ”میرے پاس ثبوت ہے۔“ مس نے کہا: ”نہیں، وہ ایسا نہیں ہے۔“ آگے سے کہتی: ”آپ کو یقین ہے؟“ مس نے کہا: ”یقین ہے۔“ تو وہ کہتی: ”اچھا چلیں۔“

پھر میری اور منیب کی مزید باتیں ہوئیں۔

مجھے نہیں پتا اس نے ایسا کیوں کیا، مگر ایک بات مجھے پتا تھی۔ یہ لڑکی منیب پر لائن مار رہی تھی اور منیب مجھے بتاتا تھا۔ مجھے لگتا ہے اس کو یہ تنگی تھی کہ منیب میرے ساتھ رہتا ہے اور اس کو موقع نہیں ملتا منیب سے بات کرنے کا۔ منیب نے مجھے

بتایا جب اس نے کہا کہ ”تمہارے دوست نے تصویر لی ہے، مجھے تم پر تو یقین ہے“ تو کہتا، میں نے دل میں کہا: ”میں تو تمہارا ابو لگا ہوا ہوں، مجھ پر یقین ہے۔“

خیر، وہ صرف منیب پر ہی نہیں، ادارے کے ہر لڑکے پر لائن مار رہی ہوتی تھی۔ حالانکہ اس کا نکاح بھی ہوا ہے اور اس کا بندہ جرمنی میں ہے۔ اور میں نے ذاتی طور پر اسے دیکھا ہوا ہے کہ وہ لائن مار رہی ہوتی ہے۔ خیر، سننے میں ملا کہ اس کے والد اچھے انسان ہیں۔ باقی مجھے علم نہیں کیونکہ میں ملا نہیں، مگر سننے میں اچھی باتیں ہی ملی ہیں۔

منیب سے بات کرتے ہوئے ہم دونوں ہنس رہے تھے۔ میں نے منیب کو کہا: ”شکریہ یار! تجھے یقین تو ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔“ خیر، اگلے دن 21 اگست کو میں نے منیب کو میسج کیا: ”یار! آج چھٹی نہ کرنا، آنا ہی آنا ہے۔ آج اس کی قوالی کرنی ہے۔“

خیر، میں اور منیب اکٹھے ادارے میں پہنچے تو جاتے ساتھ ہی مس کہتی ہیں: ”پتا تو چل ہی گیا ہو گا۔“ میں نے کہا: ”ہاں جی، آنے دیں اس کھوتے کی بچی کو، بتاتا ہوں اسے۔“ خیر، وہ تب تک نہیں آئی تھی اور میں دل میں دعا کر رہا تھا کہ یا اللہ! ایک دفعہ یہ آنے کی غلطی کر لے، پھر بتاتا ہوں اسے۔ خیر، وہ آ گئی۔

وہ جیسے ہی آئی، میں نے پرنسپل کو کہا: ”سر! میری بات سنیں۔ قسم سے، اتنا خبیث انسان، منہ سے میٹھا مگر کام بے غیرتوں والے۔“ وہ کہتا ہے: ”ہاں جی، بتائیں۔“ میں نے کہا: ”سر! اس لڑکی کو بھی بلائیں۔“ کہتا ہے: ”کیا کہنا ہے؟“ میں نے کہا: ”کچھ بات کرنی ہے۔“ کہتا ہے: ”مجھے پتا چل گیا ہے۔ دفعہ مارو! ہمیں پتا ہے کون کیسا ہے۔“

اب بظاہر یہ بات بڑی سمجھداروں والی لگتی ہے، مگر نہیں۔ جب بات عزت پر آئے تو نہیں۔ وہ آج الزام لگا رہی ہے، کل کو بڑا لگائے گی۔ یہ بات جاننے کے لیے کہ سمندر کا پانی کھارا ہے، سارا سمندر پینے کی ضرورت نہیں۔ اس نے الزام لگایا، کیوں لگایا؟ ایسے نہیں چلتا۔ خیر، انہوں نے ہماری بات نہ سنی۔

ایک کلاس سے نکلے، دوسرے میں جا رہے تھے۔ ہم درمیان میں بیٹھے تھے۔ نکلے تو روک لیں اور کہیں: ''ہماری بات سنیں۔'' زبردستی روک کر ضد کی تو کہتے ہیں: ''مس! یہ کیسے ہیں؟''ہم نے کہا: ''سر! اگر وہ چار بندے اکٹھے کر کے آپ پر الزام لگائے تو؟'' کہتا ہے: ''ایسے ہی۔'' میں نے کہا: ''سر! ہماری بھی عزت ہے۔'' آگے سے کہتا ہے: ''کون سی عزت؟ تم لوگوں کی بھی کوئی عزت ہے؟''

قسم سے اس وقت دماغ خراب ہو گیا۔ ہم نے کہا: ''اچھا چلو خیر۔'' ایک آدھی دفعہ کہا، پھر کہا: ''اچھا ایسے تو ایسے سہی سر۔'' کلاس سے باہر آئے۔ وہ میرے ڈر سے آفس نہ جائیں کہ یہ پیچھے آئے گا۔ میں نے کہا: ''سر! ہمیں ٹیسٹ دیں۔'' ان کو لگا شاید کام ٹھنڈا ہو گیا ہے، وہ چلے گئے آفس۔

پیچھے سے میں نے اور منیب نے مشورہ کیا کہ لڑکی کو بلائیں۔ میں نے کلاس میں جا کر لڑکی کو کہا: ''میری بہن! باہر آؤ۔'' خیر، وہ دو دفعہ اپنا پوچھ کر باہر آ گئی۔'' میں نے کہا: ''بیٹھو۔'' وہ بیٹھ گئی۔

میں نے کہا: ''تم نے کہا ہے میں نے تمہاری تصویر لی ہے؟'' کہتی: ''میری مس سے بات ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا: ''میرے بغیر کیسے بات ہو گئی ہے؟'' میں نے فون سامنے رکھا، کہا: ''نکالو تصویر۔'' کہتی: ''دوسرے والے سے لی ہے۔'' میں نے منیب کا فون اٹھایا اور رکھ کر کہا: ''نکالو۔'' کہتی: ''تم نے ڈیل کر دی ہو گی۔''

میں نے کہا: ''یہ فون لے جاؤ، اس میں سے ڈیٹا ریکور کروا کر لاؤ اور نکالو تصویر۔'' پھر جب اس کو لگا میں پھنس گئی ہوں تو انگریزی میں کہنے لگی: ''میری مس سے بات ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا: ''دوبارہ انگریزی نہ بولنا، اردو میں بات کرو۔'' اسے لگا شاید میں کوئی ان پڑھ ہوں، انگلش پڑھنا، لکھنا، بولنا نہیں جانتا۔ پھر انگریزی میں بولنے لگی تو میں نے انگریزی میں جواب دیا: ''تمہیں لگتا ہے میں انگریزی بول نہیں سکتا؟ میں بالکل بول سکتا ہوں۔ تو اب اپنی بکواس بند کرو اور تصویر نکالو۔''

جب وہ سمجھ گئی کہ میں یہاں بھی پھنس گئی ہوں تو اٹھ گئی اور ادھر اُدھر مس کو بلا لائی۔ مس آ گئیں۔ مس کہتی ہیں: ''کیا ہوا ہے؟'' وہ کہتی: ''مس! میری آپ سے بات نہیں ہوئی۔'' مس کہتی ہیں: ''ہوئی ہے۔'' میں نے کہا: ''مس! میرے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ معافی مانگے۔''

وہ کلاس میں جانے لگی۔ میں نے کہا: ''میں پولیس کو کال کر دوں گا۔'' اب وہ ڈر گئی۔ وہ کہتی: ''تم مجھے بہن کہہ رہے ہو اور بدتمیزی کر رہے ہو۔'' میں نے کہا: ''میں تمہارے جیسوں کی عزت نہیں کرتا۔''

خیر، میں نے مس سے کہا: ''یہ بولتی ہے اس کے پاس ثبوت ہیں۔ دکھائے ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔'' کہتی: ''مجھے شک ہوا تھا۔'' میں نے کہا: ''اگر تمہیں شک ہوا تھا تو تم نے یہ کیوں کہا میرے پاس ثبوت ہیں؟'' اصل میں وہ مجھے ڈرانا چاہتی تھی ثبوت کا کہہ کر۔ میں الٹا اسے پڑ گیا: ''دکھاؤ ورنہ میں پولیس بُلا لوں گا۔''

اب جب اسے کوئی حل نظر نہیں آیا تو آنسوؤں کا سہارا لے لیا۔ رونے لگ گئی۔ خیر، مس نے صلح صفائی کروادی، حالانکہ وہ بھی جانتی تھیں کون غلط ہے اور کون نہیں۔

سر کو میں نے کہا: ''باہر آئیں۔'' وہ ڈرپوک کہتا ہے: ''میں نے نہیں آنا۔''

مس نے کہا: ''آپ جائیں۔'' ہم نکل گئے۔ راستے میں ہمیں خبر پہنچی کہ سر ہمارے گھر کال کرنے والے ہیں۔ ایک تو غصہ آیا کہ بانسبت ہمارا ساتھ دینے کے یہ کیا ہو رہا ہے۔ خیر، منیب کے تو گھر ہی کال جانی تھی۔ میرے گھر والوں کا نمبر سر کے پاس نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا میرے ہسپتال والوں کا نمبر سر کے پاس تھا کیونکہ وہ رشتے دار ہیں آپس میں اور میں ان کے ریفرنس سے گیا تھا۔

مجھے شک تھا۔ میں نے منیب سے کہا: ''اپنے ابو کو جا کر سر کی کرتوتیں بتانی ہیں۔'' اور میں ہسپتال پہنچ گیا۔ میں نے جا کر انہیں بتا دیا، مگر ہونا وہی تھا جو ہوتا ہے کہ رشتے دار کا ساتھ رشتے دار دیتا ہے۔ انہوں نے مجھے بھی غلط نہیں کہا، انہوں

نے کہا: ''ہم مانتے ہیں تم سچ کہہ رہے ہو، وہ لڑکی گشتی ہے، اس کو اپنی عزت کا خیال نہیں۔ مگر تم نے پولیس کو کال نہیں کرنی چاہیے تھی، تماشا نہیں لگانا چاہیے تھا۔''

ایک تو ہماری پولیس، ہمارا معاشرہ... قسم سے دل یہی ہوا تھا کہ عورت دبی ہوئی ہے۔ ''اچھا ہوا ہے ان کے ساتھ۔'' یہ ساری ایسی ہی ہیں، کیونکہ یہاں عورت رو دے تو پولیس والے مجھے لے جائیں گے، مجھ پر ہی ساری بات آ جائے گی۔

عورت نے جو کہہ دیا وہی حق ہے۔

خیر، انہوں نے کہا: ''ابھی کچھ دن وہاں نہیں جاؤ۔'' میں نے کہا: ''میں جاتا ہی نہیں۔''

اچھا، اگلے دن مجھے مس نے شام کو بتایا۔

سر کو ہم کہتے رہ گئے کہ ''سر! اس سے معافی منگوا کر دیں، ایسا نہ ہو کل کو یہ آپ پر آئے، تب آپ کو سمجھ آئے۔'' مگر انہوں نے کہاں سنا، بلکہ اُلٹا ہمیں کہنے لگے: ''ایسے ہی۔'' میں نے کہا: ''سر! ہماری بھی عزت ہے۔'' آگے سے کہتے ہیں: ''تم لوگوں کی بھی عزت ہے؟''

ہمیں بہت برا لگا، مگر آسمان و زمین کا رب بڑا انصاف کرنے والا ہے۔ اور سر کا بھانجا، وہ اس سے بڑا بے غیرت، کہتا: ''معیظ نے ضرور کچھ کیا ہو گا تو وہ بولی ہے۔''

خیر، مس نے بتایا کہ وہ لڑکی میرے پاس آج باہر آئی اور کہتی ہے: ''مس! میری بات ابھی سنیں۔'' مس نے کہا: ''بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' کہتی ہے: ''اندر دو لڑکے ہیں، انہوں نے میری تصویر لی ہے۔'' مس نے کہا: ''سر کو جا کر بتاؤ۔''

اس نے اندر جا کر سر کے سامنے تماشا لگا دیا: ''ان کو بلائیں۔'' سر نے کلاس میں جا کر دیکھا تو اس نے جس کا کہا وہ سر کا بھانجا اور ایک اور لڑکا تھا۔ اب سر کے بھی رنگ اُڑ گئے، بھانجے کے بھی اُڑ گئے اور لڑکے کے بھی اُڑ گئے۔

خیر، بہت تماشا بنا وہاں۔ پھر مس کہتی ہیں کہ سر بعد میں باہر آئے تو کہتے ہیں: ''یہ لڑکی پاگل تو نہیں؟'' مس نے سر سے کہا: ''کل تک تو وہ لڑکا پاگل تھا، آج اپنے پر بات آئی ہے تو لڑکی پاگل ہو گئی؟''

2025/08/25

شاید آج کی تحریر میں زیادہ نہ لکھ سکوں اور بس ایک اپنے پرانے پوائنٹ پر بات کروں۔ میں اس وقت اس پر بات کرنا چاہتا تھا، لکھنا چاہتا تھا، مگر پتا نہیں کیا ہوا تھا، میں لکھ نہیں سکا تھا۔ اس وقت تو میرے دل میں بہت سی باتیں تھیں، مگر میں نے بس نقطہ لکھ دیا تھا۔ کہ بعد میں بھول نہ جاؤں۔

میں نے ایک اندازہ لگایا ہے کہ جب ایک انسان بڑا ہوتا ہے تو وہ معاشی مسائل میں سے بھی گزرتا ہے۔ پیسہ کمانا بھی اس کی ضرورت بن جاتا ہے۔ انسان ذرا جنگل کے قانون سے الگ ہے، مگر مکمل طور پر نہیں۔ انسان نے جذبات کے نام پر دوسروں کو ویسے ہی ڈسنا شروع کر دیا ہے جیسے ایک سانپ ڈنستا ہے۔

وہ شاید ہی کوئی کروڑوں میں کوئی ایک ہو گا جس کو برائی کا موقع ملے اور وہ نہ کرے۔ مگر آج تو جس کو برائی کا موقع ملے تو وہ تو کرے گا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، میں ایک دفعہ پیپر دے رہا تھا۔ سر ہماری کلاس میں ہم پر نگران تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور پوچھا: "کون کون نقل کرتا ہے اس کلاس میں؟"

اب میں وہاں کیا بتاتا، میں خود بھی کر رہا تھا۔ ہاہاہاہا! میں نے سیدھا کہا: "سر، یہاں میں کسی کا نام نہیں لیتا، مگر اتنا کہوں گا جس کو موقع ملے گا وہ ضرور کرے گا۔"

انسان بڑی عجیب مخلوق ہے۔ ان کی زبان اور قانون اور اصول اور عمل بہت الگ ہیں۔ مثلاً زبانی قانون اور فطرت کہتی ہے کہ آپ جس کو جتنی عزت دیں گے وہ بھی آپ کو اتنی عزت دے گا، مگر یہ بہت کم ہوتا ہے۔

آپ یہاں کسی کو عزت دے کر دیکھیں، اگلا آپ کے سر پر چڑھ کر آپ کی عزت کی دھجیاں اڑا کر رکھ دے گا۔ آپ پیار سے بات کر کے دیکھیں، اگلا آپ کو کمتر، منہوس سمجھ لے گا۔ آپ یہاں پیار میں کسی کا ہاتھ چوم کر دیکھیں، وہ آپ کو غلام تصور کر لے گا۔

یہاں سب کہتے ہیں کہ دنیا میں اچھے لوگ نہیں، مگر ہم خود بھی تو اچھے نہیں ہیں۔ دنیا میں ہر شخص نے دوسرے کو پھنسایا ہوا ہے جان بوجھ کر۔ اگر ہم کسی کی وجہ سے پھنسے ہوئے ہیں تو کوئی ہماری وجہ سے بھی پھنسا ہوا ہے۔ اب ضروری نہیں کہ اس کا ہمیں علم ہو یا نہ ہو۔

اچھا، میں بات کر رہا تھا معاشی مسائل پر۔ جب ایک انسان بڑا ہوتا ہے وہ معاشی مسائل میں گھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ دوسری طرف جذبات کے نئے چکر میں داخل ہوتا کیونکہ بچپن میں دماغ چیزیں بھول جاتا ہے، اسی لیے بچپن ہم میں سے کسی کو یاد نہیں۔

مگر جوانی میں دماغ مضبوط ہوتا ہے، اس لیے اس کا چیزیں کو سمجھنے کا معیار بھی بدل رہا ہوتا ہے۔ اس کی موت سے نئی نئی واقفیت ہوئی ہوتی ہے۔ اور جب اس کے اپنے اس کے سامنے بوڑھے اور کمزور ہو رہے ہوتے ہیں، اور نئے جذبات ابھر رہے ہوتے ہیں، اور اس کو دنیا کی تنگ نظری کا علم ہو رہا ہوتا ہے، تو اس پر ایسا زمانہ آتا ہے کہ اسے لگتا ہے کہ میں ابھی مرنے لگا ہوں۔ یا اسے لگنے لگتا ہے کہ اس کے ماں باپ میں سے کوئی مرنے لگا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، خیر، وہ اس ڈر کو کئی دفعہ اپنے خیالوں میں محسوس کرتا ہے۔ وہ اکثر سوتے ہوئے ماں یا باپ کو دیکھتا ہے کہ ان کی سانس چل رہی ہے۔ کیونکہ ایک لڑکا کبھی اپنے جذبات بیان نہیں کرتا۔ ایک تو وہ ویسے ہی ایسا فطری طور پر ہوتا ہے، دوسرا اس کو معاشرہ مزید سخت کرتا ہے۔ تو وہ دور سے ٹیڑھی آنکھ کر کے یہ منظر دیکھتا ہے۔

اور میرے ساتھ بھی ایسا بہت دفعہ ہوتا ہے۔ میں اتنا سوچتا ہوں اس بارے میں کہ کیا بتاؤں۔ میں نے یہ سب اپنے ڈاکٹر سے ڈسکس کیا، اوپر سے اس نے پکڑ کر یہ باتیں میرے امی ابو کو بتا دیں۔ خیر، بابا نے مجھے کہا: "ایسی چیزیں کیوں سوچتے ہو جو تمہارے قابو میں نہیں؟"

مگر میں انہیں کیسے سمجھاؤں؟ کہ اگر یہ میرے کنٹرول میں ہوتا تو مجھے یہ باتیں ڈسکس ہی نہ کرنی پڑتیں۔

2025/08/28

آج کا دن شاید میرے لیے کچھ الگ ہو، شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔ آج کامیاب ہو جاؤں اس بات کا فیصلہ کرنے میں کہ مجھے وکیل بننا چاہیے یا ڈاکٹر۔

میں نے شروع سے ہی یہ پلان رکھتا تھا کہ جب میری انٹر ختم ہو گی تو میں ڈاکٹر بنوں گا۔ مجھے پتا چلا کہ میرا ایم ڈی کیٹ نہیں بلکہ نمز (NUMS) کا ٹیسٹ ہو گا۔ خیر، میں نے ایک ویڈیو دیکھی اور مجھے پتا چلا کہ جس کی ایم ڈی کیٹ کی تیاری ہوتی ہے وہ نمز بھی دے سکتا ہے، کیونکہ اس کا سلیبس تھوڑا زیادہ ہوتا ہے۔ تو میں نے ایم ڈی کیٹ کی تیاری کرنے کا فیصلہ کیا۔

ادارے نے مجھ سے 70 ہزار مانگے تو میں نے منع کر دیا۔ میں نے سوچا کہ یوٹیوب سے خود ہی تیاری کر لوں گا۔ خیر، اس وقت گھر میں "آرمی آرمی" ہو گئی تھی۔ مجھے ہر طرح سے سمجھایا گیا کہ ڈاکٹر کی جگہ ڈائریکٹ آرمی میں زیادہ فائدہ ہے۔ میں اس بات پر قائل ہو گیا اور سوچا کہ ڈائریکٹ اپلائی کر دیتا ہوں۔ اگر میرا نام آگیا تو ٹھیک ہے، ورنہ میں ڈاکٹر کی فیلڈ کی طرف چلا جاؤں گا۔

کیونکہ دنیا میں جینے کے لیے آپ کے پاس پیسہ اور طاقت ہونا بہت ضروری ہے، ورنہ کوئی جینے نہیں دیتا۔ خیر، کچھ دنوں بعد میرے بابا نے اپنے ایک آرمی دوست سے بات کروائی۔ اس نے مجھے کہا: "آپ دونوں میں سے ایک کر سکتے ہو، ایسا نہیں کر سکتے کہ دونوں کر لو۔ کیونکہ اگر آپ سلیکٹ ہو گئے اور آپ نے دوسرے کے چکر میں پہلا چھوڑ دیا تو وہ آپ کو دوسرے میں سے بھی نکال دیں گے، کیونکہ ان کے پیسے لگے ہوتے ہیں۔ اور اگر ریجیکٹ ہو گئے تو دوسرے کا موقع نہیں ملے گا۔"

خیر، میں نے ڈاکٹر والی فیلڈ کی جگہ وہ چنی کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ میری رول نمبر سلپ آ گئی مگر مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میرا ٹیسٹ کیسا ہے، کیا ہونا ہے اور کیا نہیں۔ بابا نے مجھے ایک افسر سے ملوایا، اس کو ویسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کیونکہ ان کے دور اور میرے دور میں بہت فرق تھا۔ خیر، انہوں نے ایک لڑکے سے میری بات کروائی جس نے مجھے تھوڑی چیزوں کے بارے میں بتایا۔ کچھ مجھے سمجھ آ گئی اور کچھ نہیں۔

رات کا وقت تھا اور اگلے دن میرا ٹیسٹ تھا۔ اس لڑکے سے بات کر کے ابھی کال بند ہی کی تھی کہ اس کی واپس کال آئی اور اس نے افسر کو شکایت لگا دی کہ میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ خیر، کال کے بعد افسر نے میری انسلٹ کرنا شروع کر دی کہ کل تمہارا ٹیسٹ ہے اور تمہیں آتا کچھ نہیں۔ مجھے بہت برا لگا کہ یار، میں تو آیا ہی اس لیے تھا کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔ خیر، اگلے دن میں ٹیسٹ دینے چلا گیا۔ صبح 6 بجے بابا مجھے چھوڑ آئے۔ سردیوں کا موسم تھا اور دھند پڑی ہوئی تھی۔ ابھی سینٹر کھلا نہیں تھا، وہاں لڑکوں سے بات کرنی شروع کر دی۔ انہوں نے مجھے تھوڑا بتایا کیونکہ وہ پہلے ٹیسٹ دے چکا تھا، اس کو تھوڑا تجربہ تھا۔ مجھے اس سے فائدہ ہوا اور اتنا پتا چل گیا کہ ٹیسٹ کی ترتیب کیا ہو گی۔

کافی دیر انتظار کروایا گیا اور 6 بجے آنے کے باوجود ہمارا ٹیسٹ 9 بجے ہوا۔ یہ کمپیوٹر بیسڈ ایم سی کیوز والا ٹیسٹ تھا۔ میں نے اس کو آرام سے پاس کر لیا۔ سر پر تلوار تو تھی مگر میں نے کر لیا۔ اور جس لڑکے سے افسر نے میری بات کروائی تھی، وہ

بھی اصل میں پہلے ٹیسٹ دے چکا تھا مگر وہ تو کمپیوٹر میں ہی فیل ہو گیا تھا، جس میں میں آرام سے پاس ہو گیا۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا: "بہت مشکل ہے، بہت مشکل!"

اس کے بعد ہمارا فزیکل چیک اپ ہونا تھا۔ تین گھنٹے بعد ہمارا فزیکل شروع ہوا مگر مجھے گھٹنے کے جڑنے والے مسئلے میں پکڑ لیا گیا اور ہسپتال سے ایکسرے کروانے بھیج دیا گیا۔ انہوں نے رپورٹ دیکھی مگر انہوں نے مجھے یہ مسئلہ والا کہہ کر نکال دیا۔ مجھے افسوس ہوا کہ یار! مگر ایک بات اچھی لگی کہ چلو میں کمپیوٹر والے میں تو نہیں نکلا گیا جس میں زیادہ تر رہ جاتے ہیں۔ مجھے ایسا مسئلہ ہوا جو میرے بس میں نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی افسوس ہوا کہ یار! یہ بھی گیا اور ڈاکٹر والا بھی گیا۔ کیونکہ ٹیسٹ کی ڈیٹ نکل گئی۔

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ جی سی یونیورسٹی میں لا کے لیے میں نے ایڈمیشن ڈالا، مگر ساتھ ہی کیونکہ فری ایپلیکیشن مل رہی تھیں، تو میں نے 9 سبجیکٹس میں ڈال دیا صرف شوق شوق میں۔ خیر، میں نے ٹیسٹ دیا۔ پتا کچھ بھی نہیں تھا، بغیر تیاری کے ٹیسٹ دینا پڑا۔ تو پہلے دو ٹیسٹ ایک ہی ٹیسٹ تھا، مطلب ایک ہی ٹیسٹ دو سبجیکٹس کا فیصلہ کرے گا۔ اس میں میں نے صحیح نشان لگا کر غلطی سے غلط باکس فل کر دیے اور وہ دونوں ٹیسٹ ہی اڑ گئے۔

باقی 7 میں سے میں نے 4 پاس کر لیے مگر لا والا نہیں کر سکا۔ پھر انٹرویو ہوئے اور میرا ایڈمیشن 3 میں ہو گیا: انجینئرنگ، میڈیا اور ایگریکلچر میں۔ مگر ایگریکلچر کا کیمپس بہت دور تھا، میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے وہاں نہیں گیا۔ میڈیا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ انجینئرنگ بس ٹھیک لگی تو میں نے فیس جمع کروا دی۔

جی سی یو میں ایڈمیشن سے پہلے میں نے باہر جانے کا پلان بنایا۔ ادھر ادھر سے پتا کیا تو مجھے جرمنی اچھا لگا۔ مگر میرے بابا کو بار بار لوگ مشورہ دیتے اور وہ میرا بار بار پتا آسٹریلیا کا کرتے۔ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ دو تین دفعہ بحث بھی اسی چکر میں ہوئی۔ خیر، اللہ اللہ کر کے وہ باز آئے۔ انٹر کے بعد مجھے انگلش سیکھنے کا شوق تھا اس لیے میں آئیلٹس کر رہا تھا۔ مجھے

ڈاکٹر نے جرمن کلاس کے بارے میں بتایا جو ان کے ماموں ہی پڑھاتے تھے۔ میں وہاں چلا گیا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ بابا نے کہا کہ باہر کے ملک تم نے چلے جانا ہے تو یہاں فیس ضائع کرنے کا فائدہ؟ فیس واپس لے لو۔ میں نے واپس لے لی اور کٹوتی ہو کر وہ بڑی مشکل سے اللہ اللہ کر کے واپس ملی۔

اب میں جرمن پڑھ رہا ہوں۔ میرا دوست منیب ہی ایک دوست ہے، ہم دونوں اکٹھے پڑھتے ہیں۔ مگر پاکستان میں گوئتھے والے جو ہمارے پیپر لیتے ہیں وہ اپوائنٹمنٹ ہی نہیں دیتے۔ بچے سال سال بس اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مجھے تو پھر بھی دو دفعہ موقع مل گیا مگر منیب کو تو ایک بھی نہیں ملا۔ ہمیں پورا سال ہو گیا ہے پڑھتے ہوئے۔

خیر، میں تنگ آ گیا کہ یار اب دل ہی نہیں کرتا پڑھنے کو۔ بندہ تیاری پوری کرتا ہے، پیپر نہیں ہوتے، یاد کیا پھر بھول جاتا ہے کیونکہ جرمن زبان بہت جلدی بھول جاتی ہے۔ میں نے سوچا کسی اور ملک کی تیاری کرتے ہیں۔ خیر، جہاں سے میں آئلٹس کر رہا تھا ان سے چین کا پتا کرنے گیا مگر انہوں نے مجھے بیلاروس کا بتایا۔ وہ مجھے اچھا لگا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہاں جائیں گے۔ ان کو 25 ہزار دیے اپلیکیشن کروانے کے لیے۔ ڈاکٹر بن سکتا تھا میں وہاں۔ مگر جب میرا آفر لیٹر آیا تو اللہ توکل، پیسوں کا مسئلہ بن گیا اور معاملات لیٹ ہو گئے۔ اور آفر لیٹر میں کافی کچھ چھپے پیسے بھی تھے جن کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا تو سر نے بات گول مول کر دی۔ بابا نے کہا: "میں اتنا نہیں کر سکوں گا، کیونکہ 20 لاکھ ابھی لگاؤں گا اور 20 لاکھ چھ ماہ بعد پھر۔"

میں اب تنگ آ گیا کہ یار! حد ہے، ہر جگہ سے یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ اتنی دیر میں میں نے ڈاکٹر حمزہ سے بات کی۔ انہوں نے مجھے حقیقت وغیرہ بتائی تو میں بھی خاموش ہو گیا۔ انہوں نے کہا: "چائنہ سب سے اچھا آپشن ہے۔" خیر، میں راضی ہو گیا۔ جب انہوں نے یہ بات ڈاکٹر فیضان کو بتائی تو وہ ناراض ہو گئے کہ میرے ہسپتال میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہو اور

مجھے خبر نہیں۔ کہنے لگے: "تم بچپن سے ہمارے پاس ہو، ہمیں دیکھ کر تمہیں شوق پڑا ہے اور تم ہم سے بات کرنا یا مشورہ لینا گوارا نہیں کر رہے؟ ڈاکٹر حمزہ کا سینئر میں ہوں، میں نے ہی اسے بھی چائنہ بھجوایا۔" خیر، اللہ اللہ کر کے معذرت کر کے بات کی تلافی ہوئی اور مجھے اپنے امی ابو کو لانا پڑا۔ خیر، بیٹھ کر بات چیت ہوئی اور ڈاکٹر فیضان نے کہا کہ آپ کا یہ بچہ ایک نہیں دو بھی نہیں بلکہ دس دس سوچوں کا شکار ہے۔

الٹی الٹی باتیں سوچتا ہے کہ یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ وہی صورتحال جو جوانوں کو ہوتی ہے کہ یا تو میں مرنے والا ہوں یا کوئی میرا اپنا۔ اب میں کیا کروں؟ یہ ڈر ہے۔ میں جتنا نکالنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ اور اندر آتا ہے۔ اس کا حل مجھے یہ لگا کہ شاید میں کسی سے بات کروں تو مجھے اچھا حل مل جائے۔ اس لیے میں نے ڈاکٹر فیضان کو بتایا کہ ایسا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔ اور یہ بھی اس لیے کہ میں ان کے پاس بیٹھا تھا، ایک مریض آیا تھا جس کو انہوں نے کہا تھا کہ زندگی میں کبھی کبھی ایسے حالات آتے ہیں جب انسان کو ایسی سوچ آتی ہے۔ اس لیے ان سے بات کی کہ شاید یہ اچھا حل نکال دیں۔ مگر انہوں نے وہ بات گھر بتا دی ماما بابا کو۔ پھر انہوں نے گھر آ کر میری انسلٹ کی کہ اپنا دماغ سیدھا کرو۔

مجھے ہمیشہ یہ سوچ آتی ہے کہ شاید میں مرنے والا ہوں یا بابا کو کچھ ہونے والا ہے، ماما کو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی میں ماما کی سانس دیکھ رہا تھا، لائٹ جلا کر۔ یہ ابھی بھی میرا حال ہے۔ مجھے لگنے لگتا ہے کہ شاید بابا کا ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے وغیرہ۔ خیر، اب میں اس متعلق کسی سے بات نہیں کرتا۔

خیر، وہاں جرمن کلاس میں نے چھوڑی نہیں۔ میں نے سوچا کہ پکا پکا سرٹیفکیٹ مل جائے گا تو کیا حرج ہے؟ اور گھر رہ کر کیا کرنا ہے؟ اچھا ہے بزی رہوں گا۔ ڈاکٹر فیضان سے ماما بابا کو ملوایا اور چالیس ہزار روپے پکڑائے اپلیکیشن پروسس کروانے کے لیے۔ خیر، وہ ہو گیا اور انہوں نے جو جو ڈاکیومنٹ کہے، میں نے پورے کیے اور ان کو دیے۔ اب سب کچھ

صحیح جا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات کسی کو پتا چلے کہ میں چائنہ جا رہا ہوں کیونکہ جو بات پھیل جاتی ہے وہ الٹی پڑ جاتی ہے۔ مگر ہوا وہی۔ ماما بابا نے سب کو بتا دیا۔

خیر، میں چپ رہا کیونکہ سب ٹھیک جا رہا تھا۔ اب انہوں نے مجھے چائنہ کے بارے میں بتایا کہ میری یونیورسٹی میں ریگنگ ہوتی ہے۔ اور انہوں نے جو باتیں بتائیں، میں اس سے ڈر گیا۔ اوپر سے ڈاکٹر لگے ہوئے ہیں اور میری بات ہی نہیں سن رہے۔ اب میں پریشان ہو گیا کہ یار اب کیا کروں؟ گھر آیا، ڈر کی وجہ سے میری نیند ہی اڑ گئی۔ میں نے سرچ کیا اور مجھے انٹرپول کا پتا چل گیا۔ میں نے انہیں میل کر دی۔

دو دن بعد میری ڈاکٹر حمزہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں بتا دیا۔ انہوں نے میری انسلٹ کی کہ یہ کیا کیا ہے؟ خیر، انہوں نے کہا: "اب دعا کرو انہیں تمہاری میل نہ ملے۔" میں نے کہا: "اچھا، مجھے نہیں پتا تھا کہ ان کو نہیں کرتے۔ یہ کوئی پولیس ہے۔" خیر، میں نے کہا: "اللہ خیر رکھے گا۔ اب یہ بات ہمارے اندر رہے، کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

اب کافی دن ہو گئے، میرا آفر لیٹر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ جرمن کلاس میں لڑکی کے الزام والا معاملہ ہو گیا۔ جمعے والے دن جب مجھے پتا چلا کہ میں بری ثابت ہو گیا ہوں، میں بڑا خوش ہوا۔ ایک دم مجھے ڈاکٹر حمزہ کا میسج آیا کہ میرے پاس کل صبح آؤ، میں نے کچھ بات کرنی ہے۔ میں تھوڑا حیران ہوا کیونکہ وہ ایسے کبھی کہتے نہیں تھے۔ خیر، میں نے پوچھا: "خیریت ہے؟ کیا ہوا؟" وہ کہنے لگے: "بھائی، تمہارا کیس خراب ہو گیا ہے۔ انٹرپول کو تمہاری میل مل گئی ہے اور وہ تمہاری یونیورسٹی پہنچ گئے ہیں۔ وہ یونیورسٹی بین کرنے پر تلے ہیں۔"

کنسلٹنٹ نے مجھے کال کر کے انسلٹ کی کہ تمہاری وجہ سے میری نوکری جانے لگی تھی۔ میں اب پریشان ہو گیا کہ یار! اچھا بھلا یہ کیا مسئلہ بن گیا ہے۔ میں نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! اب اس کا حل کیا ہے؟" انہوں نے پہلے انسلٹ کی، پھر کہا:

"ایک ویڈیو بناؤ جس میں یہ معاملے کا ذمہ لو اور یونیورسٹی کو بری کرو۔" میں نے ایک معذرت والی ویڈیو بنا کر انہیں بھیج دی۔

اب کافی دن گزر گئے، میری ہمت نہ ہوئی کہ پوچھوں معاملات کیا ہیں۔ کچھ دنوں بعد میں نے ہسپتال کا چکر لگایا اور پوچھا: "کیا سین ہے اب؟" انہوں نے کہا: "معاملہ تو کلئیر ہے، مگر جو ڈسکاؤنٹ کر رہے تھے وہ نہیں کر رہے۔ تو ڈاکٹر فیضان کو بتا دیتے ہیں، وہ بات کریں گے تو معاملات حل ہو جائیں گے۔" میں پہلے انکار کرتا رہا مگر ان کے بار بار کہنے پر کہا: "ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا کہ ڈاکٹر فیضان کے بھائی کے سامنے بات نہیں کرنی، مگر میرے بار بار منع کرنے پر بھی انہوں نے بات کر دی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر فیضان کے بھائی نے بولا کہ اس کے ابو کو بتا دو۔ یہ بات مجھے بہت بری لگی۔ وہاں ماحول گرم ہو گیا۔ سب مجھے ملامت کرنے لگے۔ ڈاکٹر فیضان نے کہا: "تیرے ابو کو بتاتے ہیں، انہیں لے کر آؤ۔" یہ مجھے اور برا لگا کیونکہ کیا میرا کوئی تعلق نہیں تھا ان کے ساتھ، مگر پھر بھی یہ سب۔ مجھے پتا تھا اگر بابا آئے تو معاملات مزید الجھ جائیں گے۔ خیر، بہت بحث ہوئی، میں فوراً گھر آ گیا۔

میں نے آتے ساتھ ڈاکٹر حمزہ کو کال کی اور کہا: "یہ آپ نے کیا کیا؟ میں منع کر رہا تھا کہ ڈاکٹر کے بھائی کے سامنے بات نہ کریں، آپ نے پھر بھی کر دی۔" انہوں نے کہا: "جو بھی بات کرنی ہے صبح آ کر ملو۔" میں نے کہا: "ٹھیک ہے، صبح کر لوں گا، مگر اب اگر کال آئی تو معاملات خراب ہو جائیں گے۔" انہوں نے کہا: "وہ نہیں کریں گے۔" میں نے سوچا: "اس سے پہلے وہ بتائیں، میں ہی بتا دیتا ہوں۔" خیر، میں نے بابا کو سب بتا دیا۔

بابا نے کہا: "میرا تجربہ کہتا ہے اب ادھر جانا بہتر نہیں ہے کیونکہ جانے سے پہلے ہی تم سب کی نظر میں آ گئے ہو۔" اگلے دن بابا نے ڈاکٹر فیضان کو کال کی۔ پتا نہیں کیا بات ہوئی۔ بابا نے مجھے کال کی اور انسلٹ شروع کر دی۔ مجھے پتا تھا کہ کوئی

بھی بندہ اپنی غلطی نہیں مانتا۔ وہ بھی کیوں مانیں گے ؟ انہوں نے تو مذاق کا ہی نام لینا تھا کہ "ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ یہ ہی سائیکو ہے کہ بغیر پوچھے اتنا بڑا قدم لیتا ہے۔"

مجھے مزید برا لگا۔ میں چپ کر گیا۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر احتشام سے بات کرتا ہوں، وہ بھی میرا دوست ہے۔ اس نے میرے ساتھ ہی جرمن زبان کے پیپر دیے تھے۔ میرا ایک رہ گیا، اس کے سارے پاس ہو گئے اور وہ جرمنی چلا گیا۔ خیر، میں نے ڈاکٹر احتشام کو میسج کیا کہ "میں نے کچھ بات کرنی ہے، فری ہو کر بتایئے گا۔" انہوں نے مجھے کال کی۔ میں نے ساری بات بتائی۔

اس نے میری بات پوری سنی اور کہا: "معیظ! میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ وہ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ انٹرپول اتنی فری ہے کہ ایسے کیسوں پر یونیورسٹی بین کرنے چلی جائے؟ ان کا تو ریڈ وارنٹ ہی پاکستانی 80 لاکھ کا ہے۔ اور یونیورسٹیاں ایسے ہی بین نہیں ہوتیں۔ کنسلٹنٹ کے کنٹریکٹ ایسے ختم نہیں ہوتے۔ یہ بات کوئی اتنی بڑی نہیں تھی۔"

واقعی یہ بات مجھے بھی سمجھ آئی کہ یہ معاملہ اتنا بڑا نہیں جتنا بنایا جا رہا تھا۔ میں نے جو میل کی تھی، وہ صرف یہ تھی:

محترم جناب / میڈم،

میرا نام عبد المعیظ ہے اور میں پاکستان سے ہوں۔ میں چین میں اپنی ایم بی بی ایس کی تعلیم حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں اور چانگشا کی ہنان یونیورسٹی آف چائنیز میڈیسن میں داخلے کے لیے درخواست دینے پر غور کر رہا ہوں۔

تاہم، یونیورسٹی کے بارے میں مزید تحقیق کرتے ہوئے، میں نے ریگنگ کے واقعات کے حوالے سے کچھ معلومات حاصل کیں۔ ایک بین الاقوامی طالب علم کے طور پر یہ مجھے بہت فکر مند کرتی ہیں۔ میں خاص طور پر پریشان ہوں کیونکہ اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ اگر اس طرح کے رویے کے بارے میں کوئی شکایت کی جاتی ہے تو سینئرز مخالف ہو سکتے ہیں۔

میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ ریگنگ کے بارے میں یونیورسٹی کے مؤقف اور نئے اور بین الاقوامی طلباء کی حفاظت اور بہبود کو یقینی بنانے کے لیے کیے جانے والے اقدامات واضح کر دیں۔

آپ کے وقت اور مدد کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

گرمجوشی سے سلام،

عبدالمعیظ

پاکستان

میرے دماغ میں فوراً ایک بات آئی کہ ڈاکٹر حمزہ کا اپنا بھی کزن ایم بی بی ایس کے لیے وہاں گیا تھا۔ یہ بات انہوں نے مجھے خود بتائی تھی کہ وہ وہاں چرس کے معاملات میں پکڑا گیا تھا جس پر اسے سزائے موت ہونی ہے۔ اور جو گولی انہوں نے اسے مارنی ہے، اس کے بھی پیسے پاکستان سے آنے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یار! وہ تو پکڑا گیا، اس کا کیس تو ثابت ہو گیا، اسے تو سزائے موت کی سزا بھی سنا دی گئی۔ اس کی یونیورسٹی تو بین نہیں ہوئی، اس کا کنسلٹنٹ تو نہیں نکالا گیا۔ اور میں نے تو کوئی غلط بات بھی نہیں کی۔ تو یہ چھوٹے سے معاملے پر اتنا سب کیسے ہو سکتا ہے؟

خیر، میں نے کچھ دن بعد بابا سے کہا: "بابا! دنیا میں سب اپنے بہترین کا فیصلہ کرتے ہیں، اور مجھے جو اپنے لیے سب سے بہترین لگا، میں نے وہ کیا۔" ڈاکٹر حمزہ سے بھی میری بات ہوئی مگر معاملات الجھ گئے۔ بابا نے کہا ہے: "کوئی اور ملک چلے جاؤ، یا پاکستان میں لا کر لو۔ یا اگر ایم بی بی ایس ہی کرنا ہے، ضد ہے، تو جاؤ چلے جاؤ چائنہ۔"

ڈاکٹر احتشام نے کہا: "معیظ! میں چائنہ جانے سے منع نہیں کرتا، کیونکہ کوئی فرق نہیں پڑتا، اتنا بڑا معاملہ نہیں ہے۔ مگر منع بھی کرتا ہوں کہ تم پہلے ہی سب کی نظر میں آ گئے ہو۔ اور پاکستان میں ڈاکٹر ذلیل ہو رہے ہیں۔ پھر دوبارہ باہر کا پلان بناتے پھرو گے۔ اب سوچ لو جو فیصلہ کرنا ہے، مگر بعد میں پچھتانا نہیں۔"

2025/09/06

میں اس وقت تھوڑا سا اپنے آپ میں پریشان ہوں کہ کیا میں عجیب انسان ہوں۔ میرے اندر خوف ہے، میرے اندر ڈر ہے، میرے اندر اداسی بھی ہے، میرے اندر خوشی بھی ہے، میرے اندر غم بھی ہے؛ مگر مجھے رونا نہیں آتا۔ میں سوچتا ہوں کہ جس دن میرے سامنے کسی اپنے کی لاش پڑی ہو گئی، مجھے رونا آئے گا—شاید نہیں، یا شاید ہاں، میں نہیں جانتا۔ مجھے کسی کے کھونے کا ڈر ہے، مگر مجھے کھو جانے کے بعد رونا آ جائے—بہت مشکل کام ہے، شاید۔ شاید اس وقت تو بالکل مشکل کام ہے کیونکہ انسان وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتا ہے؛ شاید آنے والے وقت میں میرے جذبات بدل جائیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد کو ایسا بنایا جاتا ہے کہ روئے نہیں؛ کہنا ہے کہ رونا واقعی بہت برا ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں لگتا، مگر پھر بھی میں رونے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے ایک بات یاد آتی ہے کہ ایک دفعہ میں اور ماما گھر کے باہر بیٹھے تھے تو ساتھ والی آپی نے کوئی بات کی اور کہا: "پھر رو گئے"۔ میں نے کہا: "مرد جلدی نہیں روتا"۔ کہنے لگی: "ایسے نہیں ہوتا"۔ ماما نے کہا: "یہ سہی کہتا ہے۔ اس کا باپ بھی سب سے زیادہ اپنی ماں کے انتقال پر رویا تھا بس۔" مگر میرے اندر یہ احساس، پتا نہیں کیوں، نہیں ہے۔ مجھے عجیب عجیب چیزوں پر تو رونا آتا ہے مگر کسی کی لاش دیکھ کر نہیں۔ مجھے رونے پر رونا آتا ہے —کسی کی بے بسی، کسی کی تڑپ، کسی کی مشکل؛ مگر مجھے اپنی بے بسی پر رونا نہیں آتا۔ پہلے غصہ آتا ہے اور جب سمجھ آ جاتی ہے "نہیں، میں تو بے بس ہوں" تو ہنسی آتی ہے۔

میں نفرت کرتا ہوں؛ مجھے کچھ لوگ بہت ہی برے لگتے ہیں۔ مگر میں بہت برا انسان نہیں ہوں۔ شاید میں لوگوں کے درد کو سمجھ سکتا ہوں، مگر بس کچھ چیزوں سے ناراض ہو جاتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ مدد کروں اور کچھ لوگوں کے بارے دل کرتا ہے ان کا پھنسا دوں۔ میرے اندر اچھائی بھی ہے اور برائی بھی۔

2025/10/07

بہت ساری باتوں کے اندر جو اس سیکنڈ میرے دل و دماغ میں اٹھ رہی ہیں، میں اندھیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید میں کامیاب ہو کر بھی کامیاب نہیں ہو سکا؛ میں ناکام رہ گیا۔ شاید سچ جان کر بھی مجھے اس میں لطف نہیں ملا، اور جھوٹ نے مجھے اتنی اذیت دی کہ سچ کے وقت میں جھوٹ کو بھول نہیں سکا۔ میرے اندر کی چیخ، میرے اندر کی آہ و بغا، میری اندر کی آواز — میرا چیزوں کو دیکھنا — ہر ایک کے اندر ایک الگ ایسی چیز ہے جو ناقابلِ بیان ہے۔ ایک آواز جو میرے خیالات میں اٹھتی ہے اور وہ مجھ سے کہتی ہے: بتاؤ، کیا تم کامیاب ہوئے؟ بتاؤ، کیا تم وہ سب کچھ پا سکے جو تم چاہتے تھے؟ بلکہ الٹا تم نے تو وہ بھی کھو دیا جو تمہارے پاس تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اپنا سکون کھو بیٹھا ہوں؛ وہ سکون جو شاید ایک بہت قیمتی چیز تھی مگر میں اس کی اہمیت کو کبھی سمجھ نہ سکا۔

مجھے اب روشنی سے نفرت ہونے لگی ہے اور میں روشنی کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ شاید میرے الفاظ الٹ پلٹ ہوں — کیونکہ میں دو تین زبانیں مکس کر کے بولتا ہوں، شاید میں اپنے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کروں اور کوشش کروں کہ اس صدمے سے باہر آؤں جس میں میں گر چکا ہوں۔ جمعے والے دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی جب میرا ڈائریکٹ کانٹیکٹ یونیورسٹی کے کنسلٹنٹ سے ہو گیا اور مجھے پتہ چلا کہ یہ انٹرپول والی کہانی ساری جھوٹ ہے؛ یہ ان کی من گھڑت کہانی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر فیضان نے مجھ سے معافی بھی مانگی اور اتنا بڑا بندہ ہونے کے باوجود کہا کہ میں تمہارے پاؤں پر ہاتھ رکھنے کو تیار ہوں — وہ بندہ مجھے اچھا لگتا ہے، وہ بندہ مجھے بہت پسند ہے؛ شاید اس لیے کہ وہ واقعی مجھ سے محبت رکھتا ہے۔ مگر ڈاکٹر حمزہ کے بارے میں میری زیادہ کوئی رائے نہیں ہے۔

جرمن کلاس میں سر سے جا کر میں نے اپنی ساری فیس زبردستی واپس لے لی، کیونکہ جب وہ نہ ہمیں پڑھا رہے تھے اور چاہتے تھے کہ ہم چھوڑ کر چلے جائیں اور انہیں ہمارا بیٹھنا بھی بہت برا لگتا تھا۔

بڑا ڈپلومیٹک سا بندہ تھا اور سر کا بھتیجا اس کے لیے میں تو سپیشل ڈنڈا بھی ساتھ لے کر گیا تھا، لیکن بدقسمتی سے وہاں وہ مجھے نہیں ملا۔ پیسے تو واپس مل گئے مگر ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، کیونکہ جس طریقے سے مجھے پیسے ضائع ہونے کا دکھ تھا، ان کو بھی دکھ ہوا — یہ ظاہری بات ہے۔ دکھ تو ہوا — کہ میں ایک سال سے ان کے پاس پڑھا اور پھر ساری فیس واپس لے لی اور ایکسٹرا پیسے بھی لیے۔

کبھی کبھی لگتا ہے کہ میں نے ٹھیک کیا، اور کبھی لگتا ہے کہ میں نے غلط کیا۔ کیوں؟ کیونکہ انہوں نے میرے ساتھ — میری دماغی حالت کے ساتھ — جو کیا، یہی بنتا تھا۔

اب مجھے لگنے لگا ہے کہ شاید میں پاگل ہو چکا ہوں؛ مجھے مینٹل ہسپتال جانا چاہیے۔

میں اس بندے سے ملنا چاہتا ہوں جو انٹی روبینہ کے ریفرنس پر ایک دفعہ ہمارے گھر آیا تھا؛ وہ مجھے تھوڑا اچھا بندہ لگا تھا۔ میں اس سے عربی زبان سیکھنا چاہتا تھا، مگر ابھی تک ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں؛ انہیں بتانا چاہتا ہوں اس آواز کے بارے میں جو مجھ سے کہتی ہے: نہیں — روشنی کی کرنیں پیلے رنگ کی زمین کی طرف آتی ہیں۔ اور کل رات تو میں نے خواب میں دیکھا جس سے میں تھوڑا سا پریشان ہو گیا: ایک مرغا مجھ سے ٹکرا گیا — اور اس کا مطلب یہ ہے کہ موت میرے ساتھ ٹکر ضرور کھائے گی۔ اب شاید مجھے موت کا ڈر نہیں رہا، لیکن میں اپنے اندر کا امن کھو چکا ہوں؛ میرے اندر امن نام کی چیز نہیں ہے۔

مجھے اب ہر چیز سے نفرت ہو رہی ہے؛ مجھے اب ہر چیز سے وحشت ہو رہی ہے۔ اب مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ فزیکل ورلڈ کے اندر روحانی دنیا کا عمل دخل نہیں ہوتا اور یہ انفرادی بس سطح کے اوپر ہوتی

ہے۔ میرے اندر سیکسول ڈیزائرز بڑھ رہی ہیں؛ کبھی دل کرتا ہے کہ کسی عورت کو پٹالوں اور اس کا استعمال کروں، اس کا جسمانی استحصال کروں، اس سے دلی خواہش پوری کروں؛ کبھی ہاتھ سے کرنے کا دل کرتا ہے۔ میں پہلے کر تا رہا ہوں — میں جھوٹ نہیں بول رہا— میں کم از کم اب خود سے سچ بولنا سیکھ گیا ہوں۔ مگر میں کیسے ایک عورت کے ساتھ یہ سب کر سکتا ہوں؟ دوسری جگہ میرا ضمیر مجھے بہت ملامت کر رہا ہے۔ نکاح ایک بہت اچھا حل ہے، لیکن میں اپنی بیوی کو کس طرح پالوں گا؟ میں کیا کروں گا، کیسے کروں گا؟

میں نے ایک اور اندازہ بھی لگایا ہے کہ جو وقت سے پہلے چیزوں کو جان جاتا ہے، وہ زیادہ خسارہ پاتا ہے؛ لیکن جو وقت سے پہلے چیزوں کو نہیں جانتے، ان کے لیے ان ایکسپیکٹڈ چیزیں رہتی ہیں اور وہ زیادہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ آگے بڑھنے میں وقت کو جاننے سے کچھ نہیں ہوتا؛ وقت کو بدلنا کبھی ممکن نہیں۔ اگر وقت بدل سکتا ہوتا تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اب میں نہیں جانتا کہ میں کیا کروں، سوائے اس کے کہ میں ایک پاگل ڈاکٹر کے پاس بیٹھوں اور وہ مجھ سے باتیں کرے؛ اور جو باتیں ہم کریں، وہ پوشیدہ ہوں۔ شاید میں یہ باتیں اس ڈائری میں تو کم از کم لکھ دوں۔ میں ایک ایسے مذہبی سکالر کے پاس بیٹھ کر ان سے بات کروں جس کا ریفرنس انٹی نے دیا تھا؛ پوچھوں کہ وہ مجھے کیا مشورہ دیتا ہے۔ میں کسی بھی مذہب سے اوپر ہو کر یہ چیزیں جاننا چاہتا ہوں: کیا میں شیطان کا پیروکار ہوں یا خدا کا؟ یہ شیطان اور خدا کے بیچ میں جو چپکلش چیز انسانوں کے اندر پنپتی ہے وہ کیوں ہے؟ کیا وہ جنت ہے؟ جس کا ذکر مذہبی کتابوں میں ہوتا ہے؟ یا یہ سب ملے جلے نام ہیں جو انسان حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اور کیا جہنم واقعی ہے؟ یا یہ وہ چیزیں ہیں جس سے انسان ڈرتا ہے، ان کا ملا جلا نام ہے؟

اگر سخت آگ — بھڑکائی جانے والی آگ — جھوٹ ہے تو پھر مذہبی کتابیں اسے اتنا ایکزیکٹلی (بخوبی) کیسے بیان کر سکتی ہیں؟ کیا میں واقعی خدا تک پہنچ سکتا ہوں؟ کیا میں واقعی اسے جان سکتا ہوں؟ کیا صرف سر جھکا لینا، کسی پتھر کے سامنے پوجہ کرنا واقعی خدا کی عبادت ہے؟ کیا کسی مذہبی زبان میں یہ کہنا کہ "میں چوری نہیں کروں گا" اور دوسری جگہ حقیقت میں چوری کرنا، واقعی انسانی قدر ہے؟ جہاں بھی اب دیکھتا ہوں، مجھے منافقت نظر آتی ہے۔

ایک جملہ ہے: جو جیسا ہوتا ہے، اسے ویسا ہی سب کچھ نظر آنے لگتا ہے — ایک اچھے کو سب اچھا اور ایک برے کو سب برا۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کچھ انسانوں کے لیے تو ایسا نہیں ہوتا۔ اگر مجھے منافقت نظر آ رہی ہے تو میں کیا سمجھوں — کہ میں منافق ہوں؟ شاید میں بھی منافق ہو سکتا ہوں؛ مان لے تو پھر جب ایک اچھا انسان برائی دیکھ کر اس کے خلاف کھڑا ہوتا ہے، کیا وہ واقعی اس برائی کا حصہ ہوتا ہے؟ اگر وہ اس کا حصہ ہوتا تو پھر اس کے خلاف ہی کیوں کھڑا ہوتا؟ ممکن ہے وہ بھی منافق ہو، مگر کبھی کبھار ایسا نہیں ہوتا۔

اب میں ان چکروں میں الجھ چکا ہوں کہ میں کیا کروں، کہاں جاؤں، کس کے پاس جاؤں، کس سے پوچھوں، کون مجھے میرے سوالوں کا جواب دے؟ شاید میں خود ہی اپنے سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں، مگر ابھی نہیں۔ اس وقت مجھے اندھیرے سے نفرت ہے اور اندھیرے سے ہی محبت ہے؛ مجھے روشنی سے نفرت ہے اور روشنی سے ہی محبت ہے۔ میں ہریالی دیکھنا چاہتا ہوں، مگر تباہی بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں انسانوں کو بچانا بھی چاہتا ہوں اور انسانوں کو مارنا بھی چاہتا ہوں۔ میں اپنے اندر لگی ہوئی اس آگ کو اپنے اوپر بھاری کر رہا ہوں جو میرے قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے؛ میرا دماغ میرے قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ کسی نے یہ بات بہت سچ کہی ہے: اپنے دماغ کو اپنے قابو میں کر لو، نہیں تو وہ تم کو اپنے قابو میں کر لے گا۔

2025/10/10

آج کا دن میرے لیے بہت خاص ہے۔ میں نے آج تسلیم کر لیا ہے کہ جو کچھ میری زندگی میں ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے۔ میں مطمئن ہو گیا ہوں۔ میں سمجھ گیا ہوں، اور سمجھ کر خوش ہو کر جینا سیکھ گیا ہوں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ یہ سیکھا کبھی بھولوں نہیں۔

میں یہ بھی سمجھ گیا ہوں کہ تکلیف والی زندگی بھی بہت ضروری ہے۔ میں نے سب کے پیسے واپس کر دیے —ڈنڈے کے زور سے جو نکلوائے تھے، سب کے، سر کے بھی، ہر ایک کے۔

میں اب خوش ہوں۔ بس ایک بات سے پریشان ہوں کہ نیند نہیں آ رہی۔ سویا نہیں جا رہا۔ تکلیف میں تھا تو کم از کم سو تو رہا تھا، چین سے سو رہا تھا۔

اب چین کی نیند کھو کر تکلیف میں بیٹھ گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں، تب تکلیف میں تھا یا اب تکلیف میں ہوں۔

بس اب یقین کر لیا ہے کہ اس سے بہتر ہوں — کہ کھڑا نہیں، لیٹا ہوں؛ سو نہیں پا رہا، تو درد میں تو نہیں، تڑپ تو نہیں رہا۔ ہر چیز کسی نہ کسی چیز سے تو بہتر ہوتی ہی ہے۔ نہ جانے اس وقت کتنے لوگ تڑپ رہے ہوں گے۔ میں تو بس جاگ رہا ہوں۔

میرا ماضی گزر گیا، اب میرا آج ہے۔

آج کو قبول کر لو اور آج کو جیو۔ اپنا ماضی بھول جاؤ — جو تھے، بس تھے۔

کل جو آنے والا ہے، وہ کبھی نہیں آئے گا۔ جب بھی آئے گا، آج ہی آئے گا۔

اسی لیے میں نے آج اپنے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ آج کو جیوں گا۔

بہتوں سے تو بہتر جی رہا ہوں۔ اس وقت بستر پر ہوں، سردی میں روڈ پر تو نہیں۔

میں مطمئن ہوں۔ مطمئن ہو جانا کامیابی ہے یا ناکامی —اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

بس ہونا چاہیے۔

جو نہیں ہوتا، وہ تیار رہے مزید تکلیف کے لیے۔

ایک تو وہ ہے جو سہہ رہا ہے، اور ایک وہ جو خود سوچ سوچ کر اپنے لیے تکلیف پیدا کر رہا ہے۔

میرے نزدیک دوسرا زیادہ بڑا بے وقوف ہے۔

سب بہتر ہو جائے گا۔

نہ بھی ہو تو کیا برا ہے؟

دعا کرو کہ بدتر نہ ہو جائے۔

اور اگر ہو بھی جائے تو کیا برا ہے؟

اچھا جیا تو سہی۔

اب جو ہے، مطمئن ہو کر وہ گزارو، اور طریقہ دیکھو کہ اس کو کیسے پوری طرح جی سکتے ہو۔

کیونکہ دنیا میں تم جو بھی کر رہے ہو، جینے کے لیے کر رہے ہو—بس جی نہیں رہے ہو۔

2025/10/11

اس وقت شام کے پورے 7 بج کر 5 منٹ ہوئے ہیں اور میں وقت کو روک نہیں سکتا۔ میں نے ابھی کافی دیر سوچ کر، غور و فکر کر کے فوراً اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ مجھے اس چیز کو لکھنا چاہیے۔ میں یہ ڈائری صرف اپنے واقعات لکھنے کے لیے لکھ رہا تھا، مگر یہ سب کبھی نہ کبھی تاریخ بھی بن جائے گا۔

جیسے ہم اپنا بچپن بھول جاتے ہیں، اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہم نے کل صبح کیا کھایا تھا یا پرسوں صبح۔ ایسے میں یہ اب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آنے والے وقت میں میں خود بھی نہ بھول جاؤں۔ یہ میرے لیے بھی بہت اہم بات ہے۔

میں نہیں جانتا کہ میں دماغی طور پر ٹھیک ہوں یا میرا دماغی توازن خود بخود بگڑ گیا ہے۔ مجھے اکثر لوگ میری حرکتوں کی وجہ سے پاگل کہتے ہیں، اور میری باتوں کی وجہ سے بے وقوف۔ آیا کہ وہ واقعی درست کہتے ہیں یا غلط — مجھے اس بات کو جاننے میں دلچسپی نہیں۔ میں دلی طور پر مطمئن ہوں کہ آیا میں پاگل نہیں ہوں، یہ ان لوگوں کی عقل میں کوئی خلل ہے یا صرف وہ میرے ساتھ ہنسی کرتے ہیں۔

میں کل رات اسپتال میں تھا اور سویا بھی وہیں۔ صبح سے دوپہر تین بجے تک وہیں رہا۔ کیمپ تھا، فری چیک اپ تھا۔ صبح مریض بہت زیادہ تھے اور پھر ایک بجے کے بعد کوئی بھی نہیں۔ میں اور ڈاکٹر حمزہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے — کبھی بحث میں لڑ رہے تھے، کبھی متفق، کبھی نہیں۔ وہی کہتا ہے، "معیظ، تم پاگل ہو، تمہیں پتا ہے!" پھر میں گھر آ گیا۔

گھر آ کر کافی دیر موبائل چلا کر میں چار بجے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں کل سے اب تک الگ الگ بندوں کے ساتھ ایک بات ڈسکس کر رہا تھا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی۔ اور کل رات کو بھی جو میں نے ڈائری میں لکھا، وہ بھی یہی لکھا تھا۔

کیونکہ میں حالیہ طور پر بہت ڈپریشن میں رہا ہوں، اور میں بڑی ہیوی دوائیاں کھاتا رہا ہوں بغیر ان کی مقدار اور نقصان جانے۔ پھر ایک دم میں خود ہی ٹھیک ہو گیا اور مطمئن ہو گیا، اور دوائیاں سب ایک دم چھوڑ دیں۔

مجھے لگ رہا تھا کہ ان دوائیوں کا کوئی سائیڈ ایفیکٹ میرے ساتھ چل رہا ہے اور مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں ساری ساری رات کروٹیں بدلتا رہتا ہوں مگر سوتا نہیں ہوں — اور ایسا ہو بھی سکتا ہے۔

میں کل بھی سب سے ڈسکس کر رہا تھا کہ مجھے کسی ہیوی نیند کی دوائی کا بتا دیں۔ میں تین چار دن سے نہیں سویا۔ مجھے ایک انجکشن سے ہی نیند آ جاتی ہے مگر سب مجھے یہی بتا رہے تھے کہ اس کا استعمال کرو گے تو ہارمون ڈسٹرب ہو جائیں گے، فائدہ نہیں ہے۔

اس لیے میں وہ بھی نہیں لگا رہا تھا، حالانکہ لگانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں تھکاوٹ محسوس بھی کرتا تھا مگر دیکھنے میں فریش ہی لگتا تھا۔ صبح جب سب اٹھ جاتے تو تھوڑی دیر بعد میں بھی بالکل ٹھیک ہو جاتا۔

کوئی یقین نہیں کر رہا تھا مگر مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میں تو سچ جانتا تھا۔ وہ لوگ مجھے الگ الگ مشورے دے رہے تھے — کوئی کہتا جاگتے رہو نیند آ جائے گی، کوئی کہتا ورزش کرو، صبح اٹھ کر میوزک سنو وغیرہ وغیرہ۔

خیر، میں واپس گھر آیا اور سوچا کہ سو جاؤں۔ لیٹ گیا، کروٹیں بدل بدل کر ابھی اٹھ بیٹھا اور اندازہ ہوا کہ نہیں یار، یہ کچھ اور ہے۔

میں سو رہا ہوں، سو جاتا ہوں، مگر میری نیند عجیب ہوئی ہوئی ہے۔ کچی نیند ہے جس میں میری فزیکل باڈی ایکٹو رہتی ہے۔ اس لیے کافی دیر لیٹنے کے بعد بھی میں مزید تھکاوٹ ہی محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ آرام تو ہو نہیں رہا ہوتا، اس لیے تھوڑی دیر بعد خود ہی باڈی ٹھیک ہو جاتی ہے۔

تھکاوٹ کسی اور وجہ سے ہلکی ہلکی رہتی ہے۔ موسم بھی ایک وجہ ہو سکتا ہے۔

کیونکہ موسم ایسا ہے کہ پنکھا چلاتے ہیں تو سردی لگتی ہے، اور بند کرتے ہیں تو گرمی۔

مگر نیند ہو رہی ہے، کچی۔ بس مجھے پتا نہیں چل رہا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں جو خواب دیکھ رہا ہوں، جاگتے ہی ساتھ بھول جاتا ہوں۔ ابھی ایسا ہوا ہے، مگر ابھی تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی ہے۔

خواب مکمل نہیں بھولا، اور مجھے کل رات والا بھی خواب یاد آ گیا —اور ایک پرانا بھی، جو شاید میں نے ایسے ہی کسی وقت دیکھا تھا۔ پہلے تو میں کل رات والا خواب بیان کرتا ہوں، جو بہت ہی عجیب تھا۔ ابھی والا پورا یاد نہیں، مگر کل رات والا عجیب بات ہے، پورا یاد آ گیا ہے حالانکہ وہ مجھے پہلے یاد نہیں تھا۔

مجھے ابھی بھی کبھی لگتا ہے کہ میں نے کوئی ویڈیو ایسی دیکھی ہے، پھر لگتا ہے نہیں یار، ایسی کوئی ویڈیو نہیں دیکھ سکتا میں۔ کیونکہ اتنی بے فضول سی ویڈیو کوئی پاگل ہی دیکھے گا۔

میں نے ایک عجیب سا گھر دیکھا۔ گھر بہت عجیب تھا۔ میں گھر سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیسا تھا۔ کیونکہ مجھے خود بھی غلطی لگ رہی ہے، اس لیے گھر کی تھوڑی سی ترتیب سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اسی لیے لگتا ہے کہ یہ خواب ہی دیکھا تھا، کوئی ویڈیو نہیں۔ ورنہ میں گھر کا نقشہ نہ بھولتا، لیکن گھر بار بار اپنا تھوڑا نقشہ بدل رہا ہے۔ یہ شاید کچی نیند کی وجہ سے ہو سکتا ہے— کہ میں ایک ہی خواب کا حصہ بنا رہا، مگر الگ الگ سمت سے۔

میں نے جو گھر دیکھا، وہ بس ایک سیڑھی اوپر چڑھتی تھی۔ سیڑھی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ چھت اس گھر کی کوئی نہیں تھی۔ میں ایک نقشہ بنانے کی کوشش کرتا ہوں، فرضی مشرق مغرب لگا کر سمجھانے کے لیے۔

گھر میں تقریباً کوئی چیز نہیں تھی، کوئی کمرہ نہیں تھا۔ صرف ایک سیڑھی تھی۔ اور اس سیڑھی کے ساتھ ایک بڑا سا اسٹپ سمجھ لیں، اس طرح کا ایک بڑا اسٹپ نیچے تھا، اور ایک اوپر بنا ہوا تھا۔ اوپر والے اسٹپ سے کھڑے ہو کر باہر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

سیڑھیاں بہت باریک تھیں۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار مغرب کی طرف تھی، موٹی قسم کی۔ اور عجیب بات یہ کہ اس دیوار کے اندر قبریں بنی ہوئی تھیں —ہر سٹیپ کے ساتھ ایک قبر موجود تھی۔ قبریں سٹیپ کے اوپر نہیں بلکہ دیوار کے اندر تھیں مطلب یہ زمین کھو کر جیسے مردے کو زمین کے اندر ڈالتے ہیں ویسے نہیں تھیں بلکہ جیسے

پرانے زمانے میں گھر کی دیوار کے اندر ایک خاص جگہ بنائی جاتی تھی جس میں چراغ رکھتے تھے ویسی ہی بڑی بڑی جگہ جس میں ایک مردہ دفن ہو جائے۔ یہ قبریں سٹیپ بائی سٹیپ نیچے کی طرف جاتی تھیں مطلب ہر سٹیپ پر کھڑے ہو کر دیوار کی طرف دیکھتے تھے وہ وہاں ایک قبر تھی۔

گھر کے اندر ساؤتھ کی طرف سے داخلہ تھا، مگر وہ دروازہ کوئی خاص دروازہ نہیں تھا—بس ایک ملبہ سا پڑا ہوا تھا۔ ساؤتھ کی جانب سے اندر آ سکتے تھے، مگر اندر آ کر سامنے نارتھ کی دیوار تھی، ویسٹ کی دیوار تھی، ایسٹ کی دیوار تھوڑی سی۔ ایسٹ اور ساؤتھ کے درمیان ملبہ ٹیڑھا پڑا ہوا تھا۔

سیڑھیاں دو سٹیپ ایسٹ سے ویسٹ کی طرف اوپر چڑھتی تھیں، پھر ساؤتھ سے نارتھ کی طرف جاتی تھیں۔ اوپر جا کر ایک بڑا سا اسٹپ تھا جہاں سے پورے گھر کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ گھر میں کوئی چھت نہیں تھی، برآمدہ سا تھا۔ نارتھ کی پوری دیوار تھی، ویسٹ کی بھی، ایسٹ کی تھوڑی، اور بیچ میں ملبہ۔

ہر سٹیپ پر قبر تھی، اور ان قبروں پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ پردہ آدھی قبر کو ڈھانپتا تھا، آدھی دکھائی دیتی تھی۔

گھر میں دو عورتیں رہتی تھیں —ایک دادی، اور ایک اس کی پوتی۔ میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ جو مرد اس گھر میں داخل ہو رہا ہے، وہ کبھی لگتا ہے میں ہوں، کبھی لگتا ہے کوئی اور۔ اس لیے مجھے کنفیوژن ہو رہی ہے۔

دادی ایک بڑے اسٹپ کے ساتھ، جو سیڑھیوں کے نیچے تھا، بیٹھی رہتی تھی۔ وہ بہت موٹی، بھاری بھرکم، اور بیماریوں سے گھری ہوئی تھی۔ اٹھ نہیں سکتی تھی، چل نہیں سکتی تھی۔ پوتی جوان تھی، صحت مند تھی۔

دادی اور پوتی کے درمیان بحث چل رہی تھی —قبر پر پڑے پردے کو لے کر۔ دادی کہتی تھی کہ پردہ تھوڑا اوپر اٹھا دو مطلب آدھی قبر نظر آئے، لیکن پوتی سستی کی وجہ سے نہیں اٹھا رہی تھی۔

جب میں خواب میں انٹر ہوا تو دیکھ رہا تھا کہ وہ مرد کبھی میں ہوں، کبھی کوئی اور۔ لڑکی کو اس مرد سے محبت ہو جاتی ہے — کبھی لگتا ہے وہ مجھ سے، کبھی لگتا ہے اس سے۔ اس لیے میں کنفیوز ہوں کہ ہم دو الگ شخصیتیں ہیں یا ایک ہی۔

اب اس گھر کے اندر جو قبریں تھیں، وہ عجیب طرح کی تھیں۔ سٹیپ کے اوپر بنی ہوئی، اور ان پر جو کپڑا اڈلا تھا، وہ لیر لیر پھٹا ہوا تھا۔ مختلف رنگوں کے ٹکڑے — کوئی لال، کوئی نیلا، کوئی ہرا۔

گھر ملبے کا ڈھیر لگ رہا تھا، جیسے کسی نے گرا دیا ہو۔ دادی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں دادی کے پاس بیٹھا، باتیں کیں۔ دادی نے پیار کیا، شکایت کی کہ پوتی سستی کرتی ہے۔

پھر شاید نیند کچی ہونے کی وجہ سے تھوڑا منظر غائب ہو گیا اور پھر میں نے دیکھا کہ دادی مر گئی ہے۔ اب دادی کی بھی ایک نئی قبر بن گئی ہے۔ پوتی سب سے اوپر والے اسٹپ پر تھی، اور دادی نیچے والے پر۔

دادی کو قبر میں لٹا دیا گیا۔ وہاں دو تین قبریں خالی تھیں — شاید اس لڑکی اور اس لڑکے (یا میرے) لیے۔

پھر ایسا لگا جیسے اس لڑکی کی شادی اسی مرد سے ہو گئی — شاید وہ میں نہیں تھا۔ دونوں خوش رہنے لگے۔

گھر کے ملبے کے دوسری طرف کچھ آدمی کھڑے تھے، شاید وہ دادی کی قبر پر آئے تھے۔ لڑکی ان سے بیزار چھت پر کھڑی تھی۔ لیکن جب اسے حقیقت کا احساس ہوتا ہے، تو وہ دادی کی قبر پر پڑا کپڑا ٹھیک کر دیتی ہے۔

یہ پورا خواب بہت عجیب تھا۔ نہ اس کا سر سمجھ آ رہا ہے، نہ پاؤں۔ اسی لیے مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی ویڈیو نہیں، بلکہ خواب ہی ہے۔

میں کنفیوز اس لیے بھی ہوں کہ وہ اوپر والا اسٹپ اپنی جگہ پر تھا، مگر نیچے والا کبھی سیڑھیوں کے شروع میں ہی لگتا، کبھی درمیان میں۔ اور سمجھ نہیں آتی کہ وہ کپڑا کہاں سے آ رہا تھا — دیوار سے یا چھت سے؟

اس خواب کو بتانے کا مقصد یہی ہے کہ وہ گھر اتنا عجیب کیوں تھا؟ وہ عورتیں کون تھیں؟ دادی اتنی بیمار کیسے تھی؟

یہ خواب نہ ڈراؤنا تھا نہ عام، بس عجیب۔ جیسے کوئی معنی ہی نہ ہو۔

اسی طرح، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے خواب آیا، وہ تو بالکل سائنس فکشن سا تھا۔ کل رات والا خواب تھوڑا سا ڈراؤنا سا تھا، مگر یہ والا تو جیسے کسی فلم جیسا۔

مجھے لگا جیسے میں ایک عجیب سے "پلے لینڈ" میں ہوں—جزیرے پہ پہنچ جاتا ہوں، کبھی شیطانی عورتوں کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔ میں خود بھی جیسے ایک جاسوس ہوں۔

پھر ایک سائنسی کمرے میں جاتا ہوں، جہاں سخت سیکیورٹی ہے۔ وہاں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں تو گارڈ پکڑ لیتے ہیں، لڑائی ہوتی ہے۔ پھر ہم کہیں اور پہنچ جاتے ہیں۔

وہ عورتیں کبھی مرد لگتی ہیں، کبھی عورت۔ ہم اڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، کسی کا پیچھا کر رہے ہیں، کسی سے بھاگ رہے ہیں۔

پھر جب ہم اس جادوئی پلے لینڈ پہ پہنچتے ہیں جہاں بچے ہوتے ہیں، تو ہم خود بچے بن جاتے ہیں۔ کبھی میں وہ بچہ بن جاتا ہوں، کبھی اس بچے کو دیکھتا ہوں۔ کبھی ایک گھر کے اندر لڑائی ہو رہی ہے، کبھی گیمز چل رہی ہیں۔

پھر ہم جادو کر رہے ہیں۔ کسی وقت وہ پرانا واقعہ یاد آتا ہے جو پہلے دیکھا تھا—انہی جادوئی عورتوں کے ساتھ، جو کبھی مرد لگتی ہیں۔

پھر ہم ایک بلڈنگ میں اترتے ہیں۔ وہی پرانا منظر، جیسے پہلے کبھی دیکھا ہو۔

یہ خواب اتنا الجھا ہوا تھا کہ مجھے لگا شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے نیند نہیں آرہی۔ میں سو تو رہا ہوں، مگر کچی نیند میں۔ اس لیے خواب گڈمڈ ہو رہے ہیں، اور جاگتے ساتھ یاد نہیں رہتے۔

مجھے لگتا ہے جیسے میں کئی دنوں سے نہیں سویا، حالانکہ شاید سو رہا ہوں۔ ابھی بھی تھکاوٹ ہے، گلے میں تھوڑی خراش ہے، طبیعت کبھی عجیب لگتی ہے، کبھی ٹھیک۔

لیکن ایک بات سمجھ آگئی ہے—

میں سو تو رہا ہوں،

بس مجھے پتہ نہیں چل رہا۔

2025/10/12

ابھی صبح کے 10 بج کر 17 منٹ ہو رہے ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اٹھا ہوں۔ کل رات مجھے تھوڑی پکی نیند آئی اور میں اچھے طریقے سے تھوڑا سو سکا، مگر پوری رات عجیب موسم کی وجہ سے تنگ ضرور رہا۔ کبھی ناک کا ایک سوراخ بند ہو جاتا، کبھی دوسرا۔

لگاتار ایسا ہی رہا، اور ابھی جب اٹھا تو میرا دماغ اور ناک کا ایک سوراخ پوری طرح بند تھا۔ مجھے پورے کپڑے پہن کر بھی سردی لگ رہی تھی، اور میں نے باہر دیکھا تو بابا بنیان میں بیٹھے تھے، آسانی سے۔ میں بھی حیران رہ گیا کہ یار! کیسی عجیب صورتحال ہے عجیب موسم ہے کسی کو سردی لگ رہی ہے کسی کو گرمی۔

کل رات میں نے جو خواب دیکھا وہ بھی بہت عجیب تھا۔ خواب کے کئی حصے تھے، مگر سب میں ایک بات مشترک تھی۔

میں بتاتا ہوں:

میں نے دیکھا کہ میرا گھر ایک اجنبی سی جگہ پر ہے — ایک اجنبی علاقہ، ایک اجنبی سڑک کے اوپر۔ گھر دو تین منزل کا تھا۔ میں نے خواب میں اپنے گھر میں صرف خود کو دیکھا۔ میں سب سے اوپر والی منزل پر تھا، باقی سب نیچے تھے، مگر میں نے ان کو دیکھا نہیں۔ بس مجھے پتہ تھا۔

اگر گھر کی طرف منہ کرتے تھے تو گھر کے الٹے ہاتھ ایک اور گھر تھا۔ اس گھر کے رہنے والے سب کہیں گئے ہوئے تھے اور یہ رات کا وقت تھا۔ اور مجھے خواب میں بھی لگ رہا تھا کہ یہ ان کی ہی غلطی ہے، مگر پھر بھی میں ان کو کچھ نہیں کہہ سکا۔

میں نے دیکھا، اس گھر کے سارے رہنے والے کہیں گئے ہیں، بس ان کے دو بچے گھر پر تھے — ایک بچی جو بمشکل 13 سال کی ہوگی، اور ایک چھوٹا بچہ۔ اور میں یہ عجیب منظر دیکھتا ہوں کہ وہ بچی حاملہ ہے، اور ان دونوں کو کسی نے بہت بری طرح زخمی کر کے چھوڑ دیا ہے۔

میں ان کے گھر نیچے آ کر، دروازے سے داخل نہیں ہوا۔ میں نے منزل سے ہی چھلانگ لگا کر ان کے گھر پہنچا، اور سارے دروازے بند کر دیے۔ مجھے خوف اس بات کا تھا کہ جو لوگ دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ ان کی مدد کرنے کے لیے نہیں بلکہ نقصان پہنچانے کے لیے آ رہے تھے۔ مجھے روکنے آ رہے تھے کہ میں ان کی مدد نہ کر سکوں۔

میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ میں ان دونوں بچوں کا آپریشن کر رہا ہوں۔ باقی کچھ لوگ، بشمول ان کے گھر والے، دروازے توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے وہ دروازے بند رکھے تھے کیونکہ اگر کھول دیتا تو وہ دونوں نہیں بچ پاتے — وہ مر جاتے، اور الزام میرے پر لگ جاتا۔ وہ لوگ مجھے جان بوجھ کر لے جاتے۔

میں نے دیکھا کہ میں نے اس بچی کا آپریشن کیا، اس کا پیٹ سارا کھول کر بچہ باہر نکالا۔ وہ بچہ بھی زخمی تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بچی کی انتڑیاں میرے ہاتھوں میں ہیں۔ میں نے بچہ نکالنے کے بعد انتڑیاں واپس ان کی جگہ رکھ کر اس بچی کا پیٹ بند کیا۔ پھر نیا پیدا ہونے والے بچے کا علاج کیا، اور اس لڑکی کے بھائی کا بھی آپریشن کیا۔

جب وہ لوگ ہوش میں آ گئے تو میں نے دروازے کھول دیے۔ پہلے وہ مجھ سے لڑنے لگے، پھر ان کے گھر والوں نے لڑائی بند کر کے میرا شکریہ ادا کیا۔

پھر کچھ دیر بعد میں نے پھر ایسا ہی منظر دیکھا —وہ لوگ پھر گھر نہیں ہیں، اور وہی بچی پھر حاملہ ہے۔ اس دفعہ بھی میں ہی اس کی مدد کو پہنچا۔ اور جب گھر والے واپس آئے تو اس کے باپ نے میرا شکریہ ادا نہیں کیا، بس منہ بنایا۔ جیسے میں نے ان پر احسان کیا ہو، مجھے احسان کے طور پر جانے دینے پر مجبور ہو گیا۔

تیسری دفعہ وہ حاملہ نہیں تھی، بس گم تھی اور بے ہوش تھی۔ میں اسے گھر سے لے کر نکلا اور اس کے گھر والوں کے حوالے کر دیا۔ ماں تو میری احسان مند تھی، مگر باپ پھر مجبور۔ اس بچی کے دو تین اور بہن بھائی بھی میں نے دیکھے، جو میرے احسان مند تھے۔

یہ خواب تھوڑا عجیب تھا—اس لیے کہ میں ٹھیک تھا، سب جانتے تھے، مگر پھر بھی وہ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خیر، میں نے ایک اور خواب بھی دیکھا جو تھوڑا عجیب تھا۔ ایک اپنے جاننے والے کے بارے میں۔ میں نے دیکھا کہ میرے پاس ایک بہت خطرناک چوہا ہے، جو مجھے تو نقصان نہیں پہنچاتا، مگر میرے دشمنوں کو پہنچاتا ہے۔ وہ چوہا میری مدد کرتا تھا—دشمن کو کاٹنے سے ڈرا دیتا تھا، کیونکہ اس کا زہر بہت خطرناک تھا۔

وہ چوہا میری مدد اس طرح کرتا کہ وہ میرے جاننے والی کے بچوں کے لیے دودھ لے کر جاتا تھا۔ اور دشمن ان بچوں کا دادا اور باپ خود تھا۔ دادا تو پوری دشمنی پر اترا ہوا تھا، مگر باپ سویا ہوا تھا۔ جاننے والی بھی ظلم کا شکار سو رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ میری سیدھی ٹانگ مجھے کاٹنی پڑی۔ وہاں سے میں نے پورا گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا، اور پھر اپنی ٹانگ واپس لگائی۔ چونکہ میری ٹانگ زخمی تھی، مگر میں چل پا رہا تھا۔ بس میری سیدھی ٹانگ چھوٹی ہو گئی تھی۔

اس گوشت کو میں اپنے جاننے والی کے بچوں کے لیے بھیجتا کہ وہ میرا گوشت کھا کر زندہ رہیں۔ مگر ان بچوں کی پھوپھیاں ان سے چھین کر خود کھا جاتیں، مگر تھوڑا ان کو بھی مل جاتا۔

ایسا ہی ہوا کہ میں نے اپنی سیدھی ٹانگ دو دفعہ جوڑی تھی، اور میرے گوشت کا بڑا حصہ اسی سے نکل گیا۔ میں چل تو رہا تھا، مگر سیدھی ٹانگ چھوٹی ہو گئی تھی۔

آخری بات میں نے خود یہ منظر دیکھا۔ آخری بار میں نے الٹی ٹانگ سے گوشت نکالنے کا سوچا تا کہ میں آسانی سے چل سکوں، مگر میرا قد چھوٹا ہو گیا تھا۔

میرے چھوٹے بھائی نے مجھے دیکھا، مگر میری حالت پر رحم نہیں کھایا۔ میں نے جب ان بچوں کے لیے گوشت بھیجا، تو دیکھا کہ پھوپھیوں نے قبضہ کر لیا ہے، اور ان بچوں کا باپ بھی غصے میں اٹھا ہے۔ وہ میری احسان مندی کی بجائے مجھے مارنے کے لیے لپکا۔

میں نے اپنے بڑے بھائی کو بتایا۔ وہ آیا، اور اس نے ان بچوں کے باپ کو میری خاطر پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ پھر میں اٹھ گیا۔

یہ خواب بھی بہت عجیب تھا۔

ہر خواب کا مطلب ہو، ایسا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ کل میری اور وقار بھائی کی بات ہو رہی تھی۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ ان کے بارے میں ان کے جاننے والے برے خواب دیکھتے ہیں —اس کا کیا مطلب ہے؟

اور میں اس وقت ان کو یہ سمجھا رہا تھا کہ:

"دیکھ لیا، وہ آپ کے بارے میں غلط سوچتے ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ ہر خواب سچا ثابت ہو۔"

2025/10/15

آج ابھی رات کے دو بجنے والے ہیں۔ یعنی دن کا آغاز ہو چکا ہے، صرف دو ہی گھنٹے ہوئے ہیں۔ میں اسے کل کے دن کا اختتام سمجھوں یا نئے دن کا آغاز؟ شاید نئے دن کا آغاز ہی سمجھنا بہتر ہو گا، کیونکہ جو ہو جاتا ہے وہ بدلا نہیں جا سکتا۔ اور آج کو ماننا پڑتا ہے۔ اب جو اس سے منہ موڑے، تو فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بے وقوفی ہوتی ہے۔ دل مانے چاہے نہ مانے، آج کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے جب میں بہت بیمار تھا، مجھے ایک خبر ملی تھی۔ مگر اپنی ہی حالت خراب تھی، اس لیے میں اس خبر پر غور نہیں کر سکا۔ اب بہتر ہوں، تو میں نے بہت وقت لگا کر سوچا، سمجھا، جانا اور مانا کہ میرا دوست مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکا ہے۔ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔

حافظ عبد الہادی میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں، نعمان اور وہ—ہم تینوں اکٹھے بیٹھتے تھے، تینوں بہت اچھے دوست تھے۔ جب میری طبیعت بہت خراب تھی، تب میں نے نعمان کو کال کی اور پوچھا۔

اس نے بتایا کہ یہ سچ ہے۔

میں نے کہا، "مجھ سے کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے۔"

مگر وہ بولا، "کاش میں بھی کہہ سکتا..."

حافظ عبد الہادی اور میں، ہمارے میتھ کے پروفیسر کے شاگرد تھے۔ میں نے ان کو بتایا تو وہ بھی بہت غمگین ہوئے۔ مجھے ابھی اس کی بہت یاد آ رہی ہے۔ ہماری لمبے عرصے سے بات نہیں ہوئی تھی—شاید دو سال۔ آخری ملاقات ہماری کلاس میں ہی ہوئی تھی، جب میں نے I.C.S. چھوڑ کر پری میڈیکل رکھی تھی۔ اس دن میں واپس اپنی کلاس میں آیا، اور اس

سے ملاقات ہوئی۔ تب سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ دنیا میں کیا چیز کب آخری ہو، یہ کبھی نہیں معلوم ہوتا۔

تو میں نے آج سیکھا ہے:

جو بھی کرو، آخری سمجھ کر پوری طرح کرو۔

آخری لمحہ سمجھ کر پوری طرح جیو۔

مجھے آج بھی یاد ہے، شاید وہی ہماری واحد کال تھی۔ میں نے اسے کال کی، اور وہ بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے چھوٹے بھائی کا چیک اپ کے لیے کلینک لے کر آیا ہے، اور وہ اسے تنگ کر رہا ہے۔ اس کے بعد نمبر ڈیلیٹ ہو گیا، اور دوبارہ ہماری فون پر بات نہیں ہوئی۔ مگر شاید مجھے ہی پتا نہیں چلا۔ وہ پڑھائی کے سلسلے میں یو کے گیا تھا، اور وہاں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سارے گھر والے ابھی بیرونِ ملک چلے گئے ہیں۔ کنٹیکٹ ابھی نہیں ہو رہا۔ دوست بھی نمبر نہیں دے رہے، منع کر رہے ہیں گھر والوں سے بات کرنے سے۔ ان کے لیے یہ بات کوئی قیامت سے کم نہیں۔

مجھے میرے دوست عابد نے بتایا — کہ عبید نے بتایا، اور عبید کو حافظ کے چھوٹے بھائی نے — کہ ابھی کوئی ان سے کنٹیکٹ نہ کرے، وہ لوگ خود ابھی بہت پریشان ہیں۔ اس حالت میں نہیں کہ سارے سوالوں کے جواب دے سکیں۔ حافظ نے بہت وقت پہلے، جب ہم اکٹھے پڑھتے تھے، اپنی ایک نظم مجھے بھیجی تھی۔ وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لی اور سنبھال کر رکھ لی۔ جب مجھے اس کے انتقال کا پتا چلا تو وہی نظم کھول کر بیٹھا، اور پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا رہا کہ — "یار، کاش پتا ہوتا، تو زیادہ دیر بیٹھ کر باتیں کی ہوتیں!" اب اس وقت وہ برمنگھم میں دفن ہے۔ کہاں، یہ ابھی پتا کرنا ہے۔ جب اس کے گھر والوں سے بات ہو گی، تو سب پوچھ کر لکھ لوں گا۔ اور جب وہاں جاؤں گا، تو ضرور اس کی قبر پر جاؤں گا۔

حافظ عبدالہادی کی نظم:

تیری آزمائشوں سے ہوں بے خبر،

یہ میری نظر کا قصور ہے۔

تیری راہ میں قدم قدم،

کہیں عرش ہے کہیں ظہور ہے۔

یہ بجا ہے ملکِ دو جہاں،

میری بندگی میں فطور ہے۔

یہ خطا ہے میری خطا مگر،

تیرا نام بھی تو غفور ہے۔

یہ بتا میں تجھ سے ملوں کہاں،

مجھے تجھ سے ملنا ضرور ہے۔

کہیں دل کی شرط نہ ڈالنا،

دل ابھی گناہوں سے چور ہے۔

تو بخش دے میرے سب گناہ،

تو رحیم ہے، تو غفور ہے۔

یہ حمد، یہ نظم شاید وہ مجھے اس لیے ہی سنا کر گیا کہ یہ اس کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہے۔ وہ کہاں ہے، کیا کر رہا ہے، میں اسے یاد آ رہا ہوں گا ویسے ہی جیسے میں اسے کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا، مگر ایک بات جانتا ہوں —

کہ جس دن اس سے ملوں گا تو کہوں گا:

"یار، بندہ جاتے جاتے ملتا ہے، اور کہتا ہے آخری دفعہ مل رہے ہیں۔

بندہ گلے لگا کر اپنا دل کا پیار تو ظاہر کر لیتا ہے!"

میرے لیے، عبد الہادی، تم کیا اہمیت رکھتے ہو—میں الفاظ میں نہیں بتا سکتا۔ مگر میں اس حقیقت کو قبول نہیں کر پا رہا کہ ہم اب نہیں مل سکتے۔ یار، میں کیسے سمجھاؤں؟ میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کنٹیکٹ کرنے کا، مگر تمہارا نمبر نہیں تھا۔ آن لائن ریکویسٹ بھیجی، تم نے قبول نہیں کی۔ شاید تم بہت بزی ہو گئے—اتنے کہ ہماری ریکویسٹ بھی نہیں دیکھی۔ اور بغیر دیکھے، ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ بغیر گلے لگے، قبر کی مٹی گلے لگا لی۔

سنا ہے تمہارا شیڈول بہت ٹائٹ تھا— صبح پڑھائی، شام کو جاب۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں بھی جرمنی جانے کا پلان بنا رہا تھا، تو تم نے کیا کچھ جھیلا ہو گا، میں جان سکتا ہوں۔ تمہیں ہارٹ اٹیک کیسے آیا ہو گا، میں محسوس کر سکتا ہوں، کیونکہ میں نے وہ لمحے، وہ احساسات خود ایکسپیرینس کیے ہیں۔

کاش تم مجھ سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرتے، تو دل کا بوجھ کچھ کم کر لیتے۔ شاید تمہیں نہیں پتا، میں بھی کچھ دن پہلے جب تم دل کے درد میں مبتلا تھے، میں بھی اسی درد سے گزر رہا تھا۔ میں نے خطرناک دوائیاں کھانا شروع کر دی تھیں۔ کیا تم بھی کوئی دوائی کھا رہے تھے؟ تمہیں بھی کم از کم کھا لینی چاہیے تھیں۔ میں بھی شاید کچھ دن پہلے جس حالت میں تھا، مر جاتا، مگر وہ خطرناک دوائیاں مجھے تو بچا گئیں —حالانکہ ان کے کھانے سے نقصان بہت ہوا۔

شاید لوگوں کو جان بچانے کے لیے شراب پی ہی لینی چاہیے۔ ڈپریشن کس حد تک لوگوں کو مار جاتا ہے، میں ایکسپیریس کر چکا ہوں۔ وہ ڈر گزہی تھیں —دوائیاں۔

حافظ بھائی، عبد الہادی بھائی!

آپ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہو۔ میرے بارے میں بھی اللہ کو بتا دینا، اور میرے لیے وہاں سے دعا کرنا کہ اللہ مجھے بھی خوش رکھے۔ کیونکہ آپ حافظ تھے، میں دنیا سے آپ کے لیے دعا کروں گا کہ اللہ آپ کو وہاں خوش رکھے۔ جب ہم کبھی ملیں گے، تو گلے مل کر یہ بات بولیں گے: "دنیا کے بعد اب ہمیں موت نہیں!" پھر ہم دونوں اگر جنت میں گئے، تو بیٹھ کر ساری باتیں کریں گے، اور وہاں کھیلیں گے، کیونکہ دنیا میں ہم نے پڑھائی اور کام کے چکر میں اپنا وقت ضائع کر دیا، اور حاصل میں ہمارا مقدر موت ہی بنی۔ جنت میں ٹینشن نہیں ہو گی۔

مجھے آپ کی پیدائش کی تاریخ تو پتا ہے — 23 جولائی 2005۔ مگر وفات کی تاریخ معلوم نہیں۔ وہ آپ کے والد سے پوچھوں گا۔ ابھی آپ کے گھر والوں سے میری بات نہیں ہوئی۔

2025/10/16

آج بھی کیا بات ہے، کل کی طرح پورے دو بجے لکھ رہا ہوں۔ یعنی ابھی تو دن کا آغاز ہوا ہے، مگر اس وقت مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مگر ابھی یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے ڈر کس سے لگ رہا ہے — خدا سے، جو مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے؟ یا شیطان سے، جو مجھ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے؟ میں سمجھنے سے قاصر ہو رہا ہوں۔ کبھی لائٹ جلا لیتا ہوں، کبھی اندھیرا کر دیتا ہوں۔ کبھی آنکھیں کھول کر اندھیرے میں کمرے کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں، کبھی آنکھیں بند کر کے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے آس پاس ہے۔ مگر اگر شیطان میرے آس پاس ہے تو میرے سب سے قریب شیطان خود ہو سکتا ہے۔ مگر وہ تو مجھے آج تک کبھی نظر نہیں آیا۔ بلکہ مجھے لگتا ہے، اس سے بڑا شیطان تو میں خود ہوں۔ وہ تو خود مجھ سے سیکھ رہا ہے۔ شیطان نے کبھی میری طرح شیطانی کی ہی نہیں ہو گی۔ وہ کبھی کسی کو منہ چڑا کر نہیں بھاگا ہو گا۔ وہ تو بس برے کام کروانے کی پوری کوشش کرتا ہے، اور برے کام میں تو لذت بڑی زیادہ ہے اور جو کسی سے

کوئی کام کروانا چاہتا ہے وہ اسے ڈرائے گا تھوڑی ہی۔ اور میں سوچ رہا ہوں، خدا جو مجھ سے محبت کرتا ہے، میں اس سے ڈر رہا ہوں؟

کیا مجھے اس سے ڈرنا چاہیے جو مجھ سے محبت کرتا ہے؟ یا مجھے موت کے فرشتوں سے ڈر لگ رہا ہے، جو اللہ کے لیے کام کرتے ہیں؟ اور موت کا فرشتہ تو میرا رہبر ہو گا، جو مجھے اللہ تک لے کر جائے گا، دنیا سے لے جائے گا۔ دنیا کی زندگی بھی عجیب ہے — سب کے لیے مشکلات کا باعث، سب کو اس سے شکایت ہے، مگر پھر بھی کوئی جینا نہیں چھوڑ رہا اور نہ کوئی جی رہا ہے۔ یہ انسان عجیب ہیں، نہ پوری طرح جیتے ہیں اور نہ مرنا چاہتے ہیں۔ ایک امید ہی کے ساتھ جیے جا رہے ہیں، اور یقین ہے سب کو کہ وہ امید پوری ہو گی — اچھی زندگی کی۔ مگر کون سی اچھی زندگی؟ — جو جا رہی ہے، وہی اچھی زندگی ہے!

بچپن میں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم جلدی جلدی بڑے ہو جائیں تا کہ اپنی مرضی کر سکیں۔ اور جوان ہوتے ہیں تو پیسے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ہمیں مل جائے۔ اور اگر ہم اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی پیسہ لگانا شروع کر دیتے ہیں تا کہ اپنا پیشاب روک سکیں، کم از کم اپنا بستر گیلا نہ کریں۔ جوانی کوشش میں خرچ کر دیتے ہیں جاگ جاگ کر کہ یہ بن جائیں۔ بڑھاپے میں نیند ہی اڑ جاتی ہے، پھر وہ بن کر نیند کی گولیاں خرید کر سونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم کیوں نہیں سمجھ رہے کہ جینے کے لیے کچھ بننا نہیں پڑتا، جینا پڑتا ہے۔ مگر جب تک لوگوں کو یہ بات سمجھ آتی ہے، اس کی زندگی گزر چکی ہوتی ہے۔ اب لطف کیا؟ جوانی کا لطف گیا، بڑھاپے میں کیا لطف، اور موت کے بعد زندگی کا لطف کیسے لو گے؟

خیر، ڈر شاید میری اپنی ہی بنائی ایک سوچ ہے۔ میری اپنی ہی بنائی دماغ کی ایک دنیا، جو سوچ کر میرے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور جسم کانپ جاتا ہے۔ اگر ڈر، جو میں نے شیطان اور خدا کے نام سے اپنے اندر پیدا کیا ہوا ہے، میں اپنے دماغ کو

کنٹرول کر لوں تو میں اپنے جسم سے اپنی مرضی کا کام کروا سکتا ہوں۔ اپنی مکمل جسمانی قوت کو باہر نکال سکتا ہوں۔ مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ بہت اہم چیز ہے۔ میرا خیال ہے، مجھے جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ مجھے اپنا آپ کیسے کنٹرول کرنا ہے۔ میں حیران ہوں، میں نے آج بیس سال تک کیا سیکھا ہے؟ اور مجھے سکھانے والے مجھے کیا سکھاتے رہے ہیں؟ وہ تو مجھے میری قوت کو باہر لانے کا طریقہ تک نہ سکھا کر گئے۔ انہوں نے مجھے کیا سکھایا؟ مجھے تو یاد بھی نہیں۔

وہ تو مجھے بس ایک کتاب سے دو سوال لکھوا کر وہی زبانی یاد کروا دیتے تھے۔ وہ سوال کا مطلب تو مجھے پتا نہیں ہوتا تھا، بس رٹا لگانا ہوتا تھا۔ وہی لکھ لکھ کر ہاتھ پر بھی چڑھانا ہوتا تھا، اور بس وہی سوال ہی پیپر میں آتا تھا۔ وہ لکھ کر نمبر مل جاتے تھے۔ بھلا یہ کون سی پڑھائی ہے؟ مجھے تب تو سمجھ نہیں آئی، مگر جب سے اپنی سمجھ استعمال کرنا شروع کی ہے، سمجھ آئی ہے ــــ بے فضول۔ مگر زندگی میں سمجھ آ جانا، وہی سے اصل زندگی شروع ہوتی ہے۔ اور مجھے سمجھ آہستہ آہستہ آئی۔ مگر اب میں نے سیکھ لیا ہے کہ سیکھنا کیسے ہے، کیونکہ بغیر سیکھا جانے کے طریقے کے سیکھا نہیں جا سکتا۔

2025/10/22

ابھی اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے، یعنی آج کے دن کا آغاز۔ میں ابھی اپنی نانی امی کے ساتھ لیٹا ہوں۔ وہ سکون سے سو رہی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ میں ان کی صحت یابی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ کبھی ان کو چلنے میں مدد کر رہا تھا، کبھی ان کے کندھے دبا رہا تھا، کبھی سر، کبھی پانی کا پوچھتا، اور کبھی ان کے ہاتھوں کو دباتا اور ساتھ چومتا، کیونکہ مجھے اپنی نانی امی سے بہت محبت ہے۔

ان کو بھی مجھ سے بہت محبت ہے۔ وہ اکثر مجھے ڈانٹتی ہیں کہ میں راتوں کو جاگتا ہوں اور موبائل چلاتا رہتا ہوں۔ ابھی میں نے ایک ہینڈ فری کان سے نکال دی ہے تاکہ ان کے خراٹوں کی آواز سن سکوں، تاکہ مجھے سکون رہے کہ وہ ٹھیک ہیں۔ میں شاید ان کو الفاظ میں کبھی نہیں سمجھا سکتا کہ میں ان سے کتنی محبت کرتا ہوں۔

مجھے ایک بات یاد آئی۔ کچھ عرصہ پہلے، ایسے ہی پاپا کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ رات کے تقریباً دو بجے پاپا کو ایک فون آیا۔ پاپا نے تھوڑی دیر بات کی اور پھر "اِنا للہ و اِنا اِلیہ راجعون" پڑھا۔ مجھے فوراً سمجھ آ گیا کہ کسی کی وفات ہو گئی ہے۔ میں نے پوچھا، "پاپا کس کی کال تھی؟"

پاپا نے کہا، "بھائی ذوالفقار کی۔"

میں نے پوچھا، "کس کی ڈیتھ ہوئی ہے؟"

پاپا نے کہا، "سعدیہ کی نانی کی۔"

پھر پاپا سو گئے، مگر میں سوچ میں پڑ گیا کہ بھائی ذوالفقار کیوں کال کریں گے؟ ان کا تو سعدیہ آپی کی نانی سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ ان کو یہ بات کیسے پتا چلی؟ میں نے پاپا کا فون اٹھایا، نمبر دیکھا، اور اپنے موبائل سے چیک کیا۔ میں حیران تھا کہ یہ کون سا نمبر ہے۔ خیر، سوچ میں پڑا رہا اور پھر سو گیا۔

صبح پاپا میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ اس کی انگلش کیا ہو گی کہ میری مدر اِن لا کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔

میں نے کہا، "آپ کی مدر اِن لا؟ وہ کیسے آپ کی مدر اِن لا لگیں گی؟"

پاپا نے کہا، "سعدیہ کی نانی میری مدر اِن لا نہیں لگتی!"

میں نے کہا، "نہیں، آپ کی مدر اِن لا تو بڑی امی ہیں۔"

پاپا بولے، "چلو، اس نے تو میرا رشتہ ہی ختم کر دیا!"

تھوڑی دیر بحث کے بعد پاپا نے دوبارہ پوچھا،

میں نے انکار کیا۔ اصل میں میرے ذہن سے نکل گیا تھا کہ پاپا کی تو دو شادیاں ہوئی ہیں۔ وہ سعدیہ آپی کی اصل نانی کی بات کر رہے تھے۔ پاپا کی پہلی بیوی کی وفات بہت پہلے ہو چکی تھی، اس کے بعد ماما سے شادی ہوئی، اور ہم پیدا ہوئے۔ اس لیے ان کے اس گھر سے ہمارا میل جول کم رہا۔ میں بچپن میں وہاں گیا تھا کئی بار، مگر وقت کے ساتھ بھول گیا۔ بعد میں یاد آیا کہ بھائی ذوالفقار تو آپی سعدیہ کے ماموں ہیں۔ پہلے مجھے ان کا نام نہیں پتا تھا، بس دیکھا ہوا تھا۔ خیر، گھر میں میرا اچھا خاصا مذاق بنا — کہ میں نے تو پورا رشتہ ہی ختم کر دیا!

مجھے بچپن کی ایک بات یاد ہے۔ شبِ برات کے قریب ہم وہاں گئے تھے۔ پاپا مجھے اور آپی سعدیہ کو وہاں رات کے لیے چھوڑ گئے۔ وہ لوگ بہت اچھے تھے، مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ آپی سعدیہ کا ایک ماموں معذور بھی تھا — دماغی اور جسمانی دونوں طور پر کمزور۔ وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔

شبِ برات کی رات، وہاں لائٹ چلی گئی۔ ہم سب چھت پر تھے۔ وہ لوگ پٹاخے لے آئے۔ مجھے بچپن سے پٹاخے بہت پسند ہیں۔ اس دن انہوں نے مجھے پھول چھڑی پکڑا دی، میرے ہاتھ میں گھمائی، اور مجھے پٹاخے دیے۔ ہم سب ہنس رہے تھے، ایک دوسرے کے پاؤں کے پاس پٹاخے پھاڑتے۔ جب وہ ڈر جاتے تو ہم ہنستے، ان کا مذاق بناتے، اور وہ بدلے میں ہمارے قریب پٹاخا پھینک دیتے۔ وہ رات بہت مزے کی تھی۔ زیادہ کچھ یاد نہیں، مگر وہ مناظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

مجھے آج بھی یاد ہے، آپی سعدیہ کے معذور ماموں کا کمرہ شروع میں ہوتا تھا۔ وہاں ایک بابا سائیکل بھی تھی، اور وہ زیادہ تر وقت وہیں گزارتے تھے۔ ایک بار ان کے گھر میں محفل ہوئی، تو میں نے اور میرے چھوٹے بھائی نے مل کر نعت پڑھی۔ آخر میں آپی سعدیہ کے ماموں نے دعا کروائی۔

اصل میں وہ ہمارے بھی ماموں ہی لگتے ہیں، مگر سگے نہیں۔ خیر، انہوں نے اتنی لمبی دعا کی کہ میں حیران رہ گیا — کوئی دماغی معذور شخص اتنی گہری دعا کیسے مانگ سکتا ہے؟ شاید وہ یہ بھی نہ سمجھتے ہوں کہ کیا مانگ رہے ہیں، مگر وہ بہت دیر تک دل سے دعا مانگتے رہے۔ آج جب وہ منظر یاد کرتا ہوں تو حیران بھی ہوتا ہوں — وہ ہنسی، وہ خوشی...

میں اکثر سوچتا ہوں، انسانوں میں سب سے زیادہ خوش پاگل لوگ ہی ہوتے ہیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں، اس لیے خوش رہتے ہیں۔ چاہے ہار جائیں، چاہے ان کا مذاق اڑایا جائے — وہ ہنستے رہتے ہیں۔ اپنی ہار کو بھی اتنی خوشی سے مناتے ہیں جتنی اپنی جیت کو۔ ان کی خوشی یہ بھی ہوتی ہے کہ دوسرا بندہ ہنس رہا ہے۔ وہ کسی کو ہنستا دیکھ لیں تو خود بھی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔

جبکہ جو لوگ سنجیدہ زندگی گزارتے ہیں، وہ ہمیشہ الجھے رہتے ہیں — کبھی ایک ٹینشن، کبھی کوئی اور فکر۔

اور آخرکار وہ بھی اسی سے ملتے ہیں جس سے سب نے ملنا ہے — یعنی موت سے۔

تو پھر کیا فائدہ سنجیدہ رہ کر، ٹینشن لے کر جینے کا؟

کم از کم اس چھوٹی سی زندگی میں، خوش ہوتے تو ہمیشہ خوش رہتے۔

2025/10/27

ابھی اس وقت رات کے تین بجنے والے ہیں۔ میری نانی امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ان کو نیند ہی نہیں آ رہی — کبھی بیٹھ جاتی ہیں، کبھی لیٹ جاتی ہیں۔ ابھی اس وقت وہ تھوڑا لیٹی ہیں۔ ان کو دل کا مسئلہ ہے، ڈاکٹر نے بائی پاس کا کہہ دیا ہے۔ پرسوں جب وہ وہاں داخل تھیں، انجیو کے بعد وہ وارڈ میں آئیں تو میں نے پوچھا:

"امی، اسٹنٹ ڈل گئے ہیں؟"

انہوں نے کہا: "نہیں۔"

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہیں اور پھر رونا ہی شروع کر دیا۔ میں نے چپ کروایا اور پوچھا: "کیا ہوا ہے؟ رو کیوں رہی ہیں؟"

کہنے لگیں: "ڈاکٹر بائی پاس کا کہہ رہے ہیں۔" اور پھر رونے لگیں۔

میں نے اور لالا نے ہمت دی اور کہا: "امی جی، کچھ نہیں ہوتا۔"

وہ کہنے لگیں: "میرے میں اتنی ہمت نہیں اب کہ میں اس کا درد برداشت کر سکوں۔"

امی کو تسلی دی، چپ کروایا، اور پھر لالا بھی رونے لگ گئیں، مگر فوراً چپ ہو گئیں۔ ان کو احساس تھا کہ اگر ہم روئے تو امی زیادہ پریشان ہو جائیں گی۔ امی اصل میں پریشان تھیں، اور پریشان ہونا بھی بجا تھا—بائی پاس کون سا چھوٹا آپریشن ہے۔ ابھی اس وقت سب سو رہے ہیں، میں اکیلا جاگ رہا ہوں۔ امی کے پاس پوری رات میں ہی ہوتا ہوں اور دھیان رکھتا ہوں کہ کوئی مسئلہ نہ ہو۔ میرے انکل آج ماما سے کہہ رہے تھے کہ ان کو راتوں کو جاگنے سے منع کریں۔ اب انکل کو کون سمجھائے کہ یہ نسل کی مجبوری بنا دی گئی ہے — راتوں کو جاگنا۔ حالات اور چیزیں اتنی الجھی ہوئی ہیں کہ جاگنا مجبوری بن جاتا ہے، تو اب اس کو مجبوری سمجھنے کی بجائے، اس کو تسلیم کر لینا ہی عقل مندی ہے۔

میں آج کل زیادہ اس لیے جاگ رہا ہوں کہ رات بھر دھیان رکھ سکوں، چاہے امی سو بھی رہی ہوں، اور صبح جب سب جاگ جائیں تو میں سو جاؤں تاکہ بعد میں وہ دھیان رکھ سکیں۔ ابھی امی مجھ سے مرنے کی باتیں کرنے لگیں تو میں نے کہا: "امی، یہ باتیں مجھ سے کیوں کر رہی ہیں؟"

امی نے کہا: "اگر مجھ کو کچھ ہو جائے تو مجھے یہاں میرے امی ابو والے قبرستان، کوٹ عبد المالک میں دفن کرنا۔"

مرنا تو ایک دن سب نے ہے، اور خواہش بھی ٹھیک ہے، مگر یہ باتیں ایک مریض کو نہیں کرنی چاہئیں۔ میرا ماننا یہ ہے کہ انسان کو ایسی باتیں بالکل نہیں کرنی چاہئیں —انسان تب یہ بات کرے جب وہ کوئی الٹا کام کر رہا ہو۔

امی جب ہسپتال میں تھیں تو میں باہر بیٹھا تھا۔ دوست کو کال کی تھی کہ سرہانہ اور کھیس دے جائے تاکہ امی کو پکڑا دوں۔ اس نے مجھ سے پوچھا:

"معیز بھائی، کھانے پینے کے لیے کیا لاؤں؟ لمبی والی نہ نہ کرنا ورنہ میں خود کچھ اٹھا لاؤں گا۔"

میں نے کہا: "یار، آپ کو جو سمجھ آتا ہے لے آؤ، مگر زیرو پلس بسکٹ ضرور لانا، امی وہ کھا سکتی ہیں۔"

وہ کچھ ہی دیر میں آ گیا۔ میں اندر گیا —اس وقت رات کے ایک بج رہے تھے۔ حسیب باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ حسیب نے مجھے کہا:

"یار، میرا گھر پاس ہی ہے، یہاں نہ ٹھہرو، گھر آ جاؤ۔ اگر کوئی ضرورت ہو گئی تو آپ یہاں پانچ منٹ میں آ سکتے ہو۔"

میں نے کہا: "میں پہلے لالا سے پوچھ لوں تاکہ پتا چل جائے کہ میری ضرورت ہے تو رُک جاؤں، اور نہیں تو آپ کے ساتھ چلا جاؤں۔"

میں نے لالا کو کہا، لالا کہنے لگی: "ضرورت نہیں ہے، آپ جا کر تھوڑا آرام کر آؤ، اگر کچھ ہوا تو میں کال کر دوں گی۔"

مجھے اندر تھوڑا ٹائم لگ گیا تھا، پھر میں باہر آیا اور حسیب کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ ہماری بہت ساری باتیں ہوئیں، سو نہیں پائے، بس یہ ہوا کہ رات آسانی سے گزر گئی۔ سردی میں نہیں گزری، ورنہ باہر سردی میں اٹھنا بیٹھنا بہت مشکل تھا، اور لیٹنا تو بالکل ناممکن۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہسپتال کے باہر بستر لگا کر سو رہے تھے۔

حسیب کے گھر میری اس سے عبد الہادی کے بارے میں بات ہوئی۔ میں نے چند چیزیں دکھائیں تو اس نے ابھی تک کی ریسرچ کے حساب سے وہی جواب دیا جو میرا جواب تھا — کہ عبد الہادی زندہ ہے۔ اور اس کو میں نے عبد الہادی کی نظم دکھائی تو اس نے کہا: "یہ اس کی نہیں ہے۔"

اس نے سرچ کیا اور مجھے گوگل سے نکال کر دکھایا کہ یہ پہلے ہی گوگل پر موجود ہے۔ یعنی یہ عبد الہادی کی نظم نہیں ہے — وہی واحد ایک نظم، جو میں سمجھتا رہا کہ یہ اس کی ہے۔

مگر عبد الہادی کے بارے میں مکمل علم نہیں ہے کہ کیا معاملات ہیں۔ امی کو بھی مسئلہ ہوا ہے، اس لیے ریسرچ ابھی نہیں کر پا رہا۔ امی بائی پاس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ابھی کل یا پرسوں دوبارہ ہسپتال جائیں گے تو ڈاکٹر بتائیں گے، کیونکہ ابھی ان کا بورڈ بیٹھنا ہے، پھر وہ سب اس کا فیصلہ کریں گے۔

ابھی امی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں، تو میں نے لکھنا بند کر دیا تھا اور ان کے ساتھ ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی پھر لیٹ گئی ہیں۔ مجھے بھی اب نیند آ رہی ہے مگر میں سو نہیں رہا، کیونکہ ابھی سونا نہیں ہے — جب تک امی ٹھیک طریقے سے نہیں سو جاتیں۔

2025/11/03

ابھی اس وقت تقریباً 11:16 ہو گئے ہیں۔ آج قائدِ اعظم لا کالج کا میرا پہلا دن، اورینٹیشن کا دن ہے۔ قسم سے اتنا بے فضول، ٹائم ہی ضائع ہو رہا ہے۔ میں تب سے بیٹھا ہوں، بیٹھا ہوں۔ یہاں بہت سارے بچے آئے ہوئے ہیں، اور ہر ایک کے ساتھ اس کے والد یا والدہ میں سے کوئی آیا ہوا ہے۔ میں نے پاپا کو منع کر دیا تھا اور اکیلا ہی آ گیا۔ یہ کمرہ کافی بڑا ہے اور اچھا بنا ہوا ہے، مگر کرسیاں کوئی بہت مزے کی نہیں ہیں، فالتو ہیں۔ مگر لوگ اتنے آئے ہوئے ہیں کہ کمرے میں جو گزرنے کی جگہ ہے، وہاں بھی کرسیاں لگانی پڑ گئی ہیں۔

مجھے نیند بھی آ رہی ہے کیونکہ میں کل پوری رات سویا نہیں۔ کبھی کوئی کام کر رہا تھا، کبھی کوئی اور۔ مجھے پچھلے کافی دنوں سے لگ رہا ہے کہ لگتا ہے ٹائم کے چکر میں فضول سے کالج میں داخلہ لے لیا ہے، اور ابھی تو بہت زیادہ لگ رہا ہے کیونکہ انہوں نے ٹائم 10 بجے کا دیا تھا اور 11 بجے انہوں نے سب ختم کرنا تھا، مگر یہ تو ابھی تک شروع ہی نہیں ہوا۔

پتہ نہیں کس نے اس دن کیا بات کرنی ہے اور کیا کرنی ہے۔ میرا تو صبح بالکل آنے کا دل نہیں تھا، اوپر سے میرا پیٹ مجھے مزید تنگ کر رہا ہے، اور راستے میں دو دفعہ تو میرا ایکسیڈنٹ ہونے لگا تھا۔

صبح روٹی بھی نہیں کھائی کہ لیٹ ہو رہا ہوں، اور سبحان اللہ، یہاں کے کیا ہی سین بنے ہوئے ہیں۔ اوپر سے کرسیوں پر بھی اتنے تنگ ہو کر بیٹھے ہیں کہ میرے سے میرا بیگ سنبھالنا مشکل ہوا ہوا ہے۔

پاؤں صحیح طریقے سے نہیں رکھ پا رہا، عجیب ہی طریقے سے بیٹھا ہوں، اور میرا دل کر رہا ہے کہ سر لگا کر سو جاؤں۔

اچھا، یہ میرا یہاں پہلا دن تو نہیں ہے۔ میں پہلے یہاں آیا ہوں، اور یہاں کی ہیڈ سے پتہ نہیں لیکچر لیے ہیں۔ اور وہ مجھے کہتی تھیں کہ انہوں نے میرے لیکچر نہیں، میں نے ان کے لیے ہیں۔ ہاہاہا۔

اب میں کیا ہی کہوں، مجھے لگتا ہے مجھ سے بندہ ایک دفعہ بہت خوش ہو کر بات کرتا ہے، دوسری دفعہ سے وہ بور ہونے لگ جاتا ہے۔ مگر آفیشل آج پہلا دن ہے۔

اچھا، ابھی اس وقت رات 10 بج کر 25 منٹ ہو رہے ہیں، اور میں تقریباً 35 گھنٹے سے جاگ رہا ہوں۔

اب بہت تھک گیا ہوں، اب سونے لگا ہوں۔ صبح اس کے بعد اچانک سب کچھ شروع ہو گیا۔ سب نے اپنی اپنی تقریر کی۔ میں اس کا اب کسی اور دن بتاؤں گا کہ کیا ہوا تھا۔

2025/11/22

ابھی اس وقت بس آج کا دن ختم ہونے والا ہے اور 23 نومبر شروع ہونے والا ہے۔ میں کافی دنوں سے پلان کر رہا تھا کہ لکھوں، لکھوں، مگر ہر دفعہ کوئی نہ کوئی وجہ بنتی تھی اور میں لکھ ہی نہیں پاتا تھا۔ کبھی کالج کی طرف سے اتنا کام مل جاتا تھا کہ وہی لکھ لکھ کر بس ہاتھ درد شروع کر دیتا تھا، تو آگے کیا ہی میں ٹائپ کر کے لکھ پاتا۔ خیر، اور کبھی سوچ میں پڑ جاتا کہ اپنے کالج کے بارے میں لکھوں۔ اگر تو میں وہ سچ سچ لکھ دوں جو میرے دل میں ہے تو کوئی مسئلہ نہ ہو جائے، کیونکہ میرا الا کالج اس معاملے میں بہت فضول قسم کا کالج ہے۔

اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سچ سچ لکھ دوں گا، پھر جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ ہمارے کالج کا نظام بہت ہی بے فضول سا ہے۔ اس کے قول اور فعل میں بہت بڑا تضاد ہے، اور ہو بھی کیوں نہ، وکیلوں کا جو کالج ہے۔ اوپر سے ہماری کلاس بہت ہی فضول قسم کی ہے۔

میں ایک ایک کر کے کچھ لوگوں کا بتاتا ہوں جن کے ساتھ میرا روز کا ہی معاملہ بن گیا ہے۔ ہماری ڈگری تو یونیورسٹی کی ہے، بلڈنگ کالج کی ہے اور نظام اسکول جیسا۔

خیر، سب سے پہلے سی ای او۔ وہ تھوڑا اچھا بندہ مجھے لگا کیونکہ وہ تھوڑا نرم مزاج ہے، اسٹوڈنٹس سے اچھے سے بات کرتا ہے۔ باقی ہماری اس سے کوئی اتنی خاص ملاقات تو ہوتی نہیں۔

اس کے بعد ہمارے ادارے کا سی او او، نفیر احمد ملک۔ مجھے ذات وغیرہ ساتھ لگانا بہت برا لگتا ہے، اس لیے میں سیدھا نام ہی لکھتا ہوں۔ نفیر احمد صاحب بہت مشہور سپریم کورٹ کے وکیل بھی ہیں۔ نفیر صاحب تھوڑے سے سخت مزاج آدمی ہیں، ان سے ملاقات تو بہت ہی مشکل ہوتی ہے۔ مجھے تو کالج والے ان سے ملنے ہی نہیں دے رہے تھے۔

ان سے پہلی ملاقات انٹرویو میں ہی ہوئی تھی جب انہوں نے میرا انٹرویو لیا۔ انہوں نے میرا خیال ہے دو ہی سوال پوچھے تھے۔ ایک یہ کہ انٹرنیشنل کورٹ کہاں ہے، جس کا جواب مجھے نہیں آتا تھا۔ دوسرا انہوں نے پوچھا تھا کہ پاکستان کا وہ کون سا سائنسدان تھا جس کو نوبل پرائز ملا، اور اللہ کی کرنی مجھے نام اس کا بھی نہیں آرہا تھا، بس شروع والا لفظ آرہا تھا۔ خیر، نفیر صاحب نے پورا نام بول کر کہا، کیا یہ؟ میں نے کہا، جی بالکل۔ خیر، اس کے بعد انہوں نے بابا سے پوچھا کہ ہماری فیس زیادہ ہے تو آپ مینیج کر لیں گے؟ بابا نے کہا، کر لوں گا۔ بس پھر ایڈمیشن ہو گیا۔

انہوں نے مس محوش کو باہر بھیج کر مجھے اور بابا کو روک لیا اور کہا، آپ کو پتا ہے باہر میری گاڑی تیار تھی مگر میں نے روک کر تمہارا انٹرویو کیا۔ بتا سکتے ہو کیوں؟ میں نے کہا، کیوں؟ انہوں نے کہا، تمہارے بابا کا نام بھی منیر ہے اور میرے بابا کا نام بھی منیر تھا۔ بس میں نام دیکھ کر واپس آ گیا۔

یہ بات مجھے اچھی لگی۔ ایک چیز جو میں نے نوٹ کی وہ نفیر صاحب کی صحت تھی۔ حالانکہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی مگر وہ بہت ہی زیادہ کمزور لگ رہے تھے۔

رات کو میری اسد سے بات ہوئی تو میں نے اسے ساری اسٹوری بتائی۔ اس نے کہا، نفیر صاحب نے تمہارا انٹرویو لیا ہے؟ میں نے کہا، مجھے نہیں پتا نام، بس ایک کمزور سا بابا تھا جو لکڑی کی طرح سوکھا ہوا تھا۔ خیر، اس کو یہ نہیں پتا تھا کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں اور ان کی صحت کم ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے ایک تصویر بھی بھیجی جو ملتی جلتی لگتی تھی، مگر بعد میں کنفرم ہو گیا کہ یہی نفیر صاحب ہیں۔

اب آتے ہیں مس محوش کی طرف۔ قسم سے اگر میں سچ سچ بولوں تو بہت ہی فضول قسم کی یہ مس ہیں۔ ان کا بات کرنے کا طریقہ ایسا ہے جیسے پتا نہیں ٹوٹ کر پڑنے لگی ہیں۔ بیٹا بیٹا بھی بولی جائیں گی اور بات بھی عجیب طریقے سے کریں گی۔ خیر، میں ان پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

ایڈمیشن کے وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب تک آپ کا کالج شروع نہیں ہوتا، تب تک آپ آکر یہاں ٹیچرز سے مل کر پڑھ سکتے ہو۔ جس وقت میں نے یہاں ایڈمیشن کروایا تھا، میری حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ تب میں یہی سوچتا تھا کہ بس میری پڑھائی شروع ہو، مگر جیسے جیسے کالج شروع ہونے والا تھا، میرا دل اٹھنے لگ گیا اور اب تو مکمل ہی اٹھ گیا ہے۔

خیر، میں کالج گیا اور انہوں نے میری ملاقات مس آمنہ سے کروائی۔ مس آمنہ بہت ہی پیار سے بات کرنے والی خاتون ہیں۔ مجھے ان سے بات کر کے بہت اچھا لگا اور ان سے کافی لمبی بحث بھی ہوئی۔ بہر حال، کون بندہ اندر سے کیسا ہو، یہ تو کوئی نہیں جان سکتا، مگر وہ اچھے سے بات کرتی ہیں۔

میں صرف دو دفعہ گیا، اس کے بعد کالج چار تاریخ سے شروع ہو گیا۔ پہلے دن میری موسیٰ سے ملاقات ہوئی۔ وہ میرا دوست بن گیا، مگر مجھے جلدی احساس ہو گیا کہ یہ زیادہ پھینکتا ہے، اس لیے میں نے اس سے کسی قسم کی امید نہیں لگائی۔ میں نے پوری کلاس سے سلام دعا کی اور تابش مجھے تھوڑا ٹھیک لگا۔ میں نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ ایک آدھی دفعہ کے بعد وہ آ گیا اور وہ میرا دوست بن گیا۔

ہماری کلاس میں لیکچر شروع ہوئے اور انہوں نے ایک لڑکی کو سی آر بنا دیا، مگر میں اس کے سی آر ہونے سے راضی نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سی آر کوئی لڑکی ہو، کیونکہ وہ پھر الگ ہی ہواؤں میں چلے جاتے ہیں۔ اور مجھے اندر سے غصہ تھا کہ یہ کس بنیاد پر سی آر بن گئی ہے۔

اللہ کی کرنی یہ ہوئی کہ دو تین دن بعد اس سی آر لڑکی کی چھوٹی بہن کی ڈیتھ ہو گئی۔ ہمیں بہت برا لگا اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کی سی آر شپ ختم ہو گئی اور ایک لڑکے کو سی آر بنا دیا گیا۔ تب ایک بات سمجھ آئی کہ سی آر ایسے ہی نام اٹھا کر بنا دیتے ہیں۔

خیر، لڑکے کے سی آر بننے پر ہم خوش تھے کہ چلو ہم میں سے ہے۔ پھر ہوا یہ کہ کلاس کے کچھ لڑکوں نے مجھ سے کہا کہ آج کالج میں فلم لگنی ہے، تو وہ بنتی نہیں ہے۔ سی آر کی بہن کی ڈیتھ ہوئی ہے، اس لیے نہیں لگنی چاہیے۔ تم ان سب سے بات کرو۔

میں نے کلاس میں سامنے جا کر سب کو بات بتائی کہ ہمیں فلم نہیں دیکھنی چاہیے۔ پھر میں نے ایک پیپر پر سب کے نام، رول نمبر اور سائن کروائے۔ سب نے سائن کر دیے، مگر وہ سی آر لڑکا اور اس کے ساتھ ایک مچھڑ نے سائن کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے بہت برا لگا کہ یہ کام اس کا بنتا تھا۔ خیر، دو بندوں سے فرق نہیں پڑا، فلم کینسل ہو گئی، مگر دل میں بات بیٹھ گئی کہ یہ سی آر غلط ہے۔

اس کے بعد پولیٹیکل سائنس کے ایک سر نے لیکچر لیا اور لڑکوں کے نمبر اکٹھے کرنے کے لیے مجھے کہا۔ اس طرح مجھے سب کے نمبر مل گئے۔ میں نے لڑکیوں کا الگ گروپ بنا کر پھر سب کا ایک مشترکہ گروپ بنا دیا تا کہ کلاس میں بات چیت ہو سکے۔ گروپ میں مذاق شروع ہو گیا اور سب میرا مذاق بنانے لگے۔ پھر دو لڑکوں کی لڑائی ہو گئی، گالیاں نکل آئیں، دھمکیاں شروع ہو گئیں۔

ایک لڑکی نے مجھے میسج کر کے کہا کہ گروپ بند کر دو۔ میں نے گروپ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد سی آر کا میسج آیا کہ مس ازا نے تمہارے لیے میسج بھیجے ہیں۔ جب میں نے وہ پڑھے تو بہت برا لگا۔ انہوں نے کہا کہ گروپ کس نے بنانے کو کہا ہے، اسے کل ایڈمن سر سمجھائیں گے۔

رات کو میں کافی پریشان رہا، مگر صبح سیدھا ایڈمن کے پاس چلا گیا۔ انہیں پوری بات بتائی۔ انہوں نے مجھ سے درخواست لکھوائی۔ میں نے لکھ دی کہ مقصد کیا تھا اور کیا ہوا۔

پھر کلاس میں آیا۔ مس ازا نے باتیں سنائیں، پھر مجھے اور ان لڑکوں کو ایڈمن کے پاس لے گئیں۔ وہاں جا کر ان دونوں کو سسپینڈ کرنے کی دھمکی ملی، مجھے کچھ نہیں کہا گیا۔

یہ واقعہ پورے کالج میں پھیل گیا۔ سب کو پتا چل گیا۔ میرا نام مشہور ہو گیا۔ کچھ لڑکے آئے کہ ہم ڈسپلن سوسائٹی سے ہیں، مگر وہ جھوٹے لگے۔

اس کے بعد ہم مس آمنہ کے پاس گئے۔ انہوں نے بھی گروپ بنانے سے منع کر دیا۔ ہم نے سی آر کی شکایت کی۔ اب ہم مکمل اس کے خلاف ہو گئے۔

اب روز کوئی نہ کوئی ایشو بن جاتا ہے۔ کلاس کا ماحول خراب ہے۔ پیچھے سے آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ ایک فلائٹ لیفٹیننٹ سر ہیں جن کی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ میں نے کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔ بعد میں مس محوش نے مجھے بلا کر میری انسلٹ کی، حالانکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔

تابش اور نگین نے کہا کہ چپ رہو، سوال نہ کرو، سب کی نظر میں آ گئے ہو۔ میں مس ازا کے پاس گیا، بحث ہوئی، بات مزید بگڑ گئی۔ پھر میں نے اگنور کرنا شروع کر دیا۔

مس محوش کے پاس گیا، وہاں سے بھی کوئی اچھا رسپانس نہیں ملا۔

اب روز ہی کوئی نہ کوئی چیلنج ہوتا ہے۔ آج کلاس میں نگین کی دوست نے کچھ کہا۔ بات بڑھ گئی، پھر معاملہ ختم ہو گیا۔ آخر میں سی آر اور وہ مچھڑ کلاس میں باتیں کر رہے تھے، مجھے ہی لگا رہے تھے، مگر میں خاموش رہا۔

پھر میں گھر آ گیا، اور سو گیا، اور یوں میرا آج کا دن مکمل ہو گیا۔

اب اس وقت 12:54 ہو چکے ہیں، یعنی مجھے یہ سب لکھتے لکھتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔

2025/12/04

آج صبح سے لے کر ابھی تک میری سب سے بڑی بحث ہوئی ہے، مگر میں نے ایک اندازہ لگایا ہے کہ واقعی میں بہت الگ سوچتا ہوں۔ میں سب سے الٹا چلتا ہوں۔ مجھے کئی بلکہ سب ہی پاگل، بے فضول باتیں کرنے والا کہتے ہیں۔

جیسے آج، ایک فائٹر پائلٹ کا لیکچر تھا۔ وہ ہمیں پڑھا رہے تھے کہ زندگی میں کیسے کامیاب بن سکتے ہیں، مگر میں سوچ رہا تھا کہ زندگی میں ہمیں کامیاب ہونا ہی کیوں ہے؟ انہوں نے کہا کہ اگر کسی کا سوال ہے تو پوچھے، تو میں نے یہی سوال پوچھا۔ ان کے جواب سے پہلے پیچھے پوری کلاس کا قہقہہ تھا، مگر مجھے فرق نہیں پڑتا، کیونکہ جن کو عقل ہی نہیں، ان سے بندہ کیا ہی غصہ کرے۔

خیر، میں ایک بات سوچتا ہوں کہ جو بھی انسان جس چیز کو بھی کامیابی تصور کرتا ہے، وہ چیز جس بندے کے پاس ہے، تو کیا وہ اب خود کو کامیاب کہے؟ مثال کے طور پر لتا منگیشکر، جو انڈیا کی ایک بہت بڑی سنگر تھی، کہا جائے تو سب سے مشہور اور سب سے بڑی۔ ایک دفعہ اس سے بھی کسی نے پوچھا کہ کیا آپ خوش ہیں؟ اس نے کہا کہ اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے گی تو میں لتا نہیں بننا چاہوں گی۔ اس بندے نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا کہ لتا کی تکلیفیں اور مشکلیں لتا ہی جانتی ہے۔

اب کون شخص ہے جو یہ کہے کہ کامیاب ہونے کے بعد تکلیفیں ختم ہو جاتی ہیں؟ اور یہ کیسی فضول سی کامیابی ہے جس کے لیے ہم اپنی ساری زندگی ضائع کر دیتے ہیں؟

اگر کسی سے پوچھا جائے تو سب مقصد پر آجاتے ہیں کہ زندگی کا مقصد حاصل کرنا کامیابی ہے۔ ذرا لمحے بھر کے لیے بیٹھ کر سوچیں کہ کیا واقعی زندگی کا کوئی مقصد ہے؟ انسان جس مقصد کی بات کرتا ہے، وہ مذہب کا تصور ہے۔ ذرا کچھ لمحوں کے لیے مذہب سے باہر نکل کر، بالکل نیوٹرل ہو کر سوچیں، کیا زندگی کا کوئی مقصد واقعی ہے؟

اگر واقعی زندگی کا مقصد ہوتا تو وہ زندگی خود ہوتی، مگر ہم جو بھی کر رہے ہیں، زندگی ضائع کر رہے ہیں۔

کلاس میں بحث ہوئی اور لڑکے میرے سے کہنے لگے کہ تو تم کالج کیوں آرہے ہو، لا کیوں پڑھ رہے ہو، مقصد ہے۔ اب ان کو میں یہ بات نہیں سمجھا پایا، کیونکہ وہ مذہب کو بار بار لا رہے تھے۔

خیر، دیکھو، میرا یہ کام اس لیے ہے کہ میں اپنی زندگی ایسے گزارنا چاہتا ہوں کہ خوش رہوں۔ میں لا کوئی خوشی حاصل کرنے کے لیے نہیں کر رہا، میں لا لگاتار خوش رہنے کے لیے پڑھ رہا ہوں، کیونکہ زندگی تو جانی ہی ہے تو خوش رہتے رہتے جائے۔

اب ایک دوسرا پوائنٹ۔ انسان پیسے کماتا ہے، پڑھتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے تاکہ اس کے اندر کا غرور زندہ رہے۔ چاہے وہ جو مرضی کہتا رہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے، مگر ہم اپنا ایک اسٹینڈرڈ بنانے کے لیے ایسا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ زندگی کا مقصد نہیں، صرف خواہش ہے، اور خواہش کوئی مقصد نہیں۔ بس خواہش ہوتی ہے کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں، یہ بننا چاہتا ہوں۔ یہ خواہشات ہیں، مقصد نہیں۔

اسی لیے خواہشات پوری کرنے کے باوجود بھی مقصد پورا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کبھی آپ کا مقصد تھا ہی نہیں۔ اور مقصد ہو بھی نہیں سکتا، کیونکہ مقصد صرف زندگی ہے، اور وہ بڑھ سکتی ہی نہیں۔

لوگ غلطی کرتے ہیں خواہشات اور مقصد کو سمجھنے میں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو خواہشات بالکل پوری کرنی چاہئیں، اور اگر اس سے بھی بہتر بات کہوں تو خواہشات ہی ختم کر دینی چاہئیں، کیونکہ اگر خواہشات ہی نہیں رہیں گی تو دکھ بھی خود بخود ختم ہو جائے گا۔

2025/12/12

آج کا دن کچھ بہت اچھا اور کچھ بہت برا تھا۔ میں اس بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میں آج کے دن کو کس طرح کا سمجھوں۔ ابھی اس وقت رات کے 12 بجنے والے ہیں اور میں اندر سے بہت خالی خالی محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی مجھے کس کی یاد آ رہی ہے، مگر مجھے اس وقت ہر ایک کی یاد آ رہی ہے کہ میں کسی سے بات کروں، کسی کے ساتھ ہنسی مذاق کروں، کسی سے باتیں کروں، کچھ کروں، کہیں باہر گھوموں پھروں۔

مگر کیا واقعی میں ہی دنیا کا سب سے فارغ آدمی ہوں جو ہر وقت گھومنا چاہتا ہے؟ میں نے بہت سارے لوگ دیکھے ہیں جو یہی دعویٰ کرتے ہیں، مگر وہ گھومنے کے وقت جاتے نہیں۔ کبھی کوئی مسئلے کا بہانہ، کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔

میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو ایک دفعہ جینا چاہیے، کھل کر۔ نہ جانے کتنے ہی کام لوگوں کے رہ گئے جو دنیا سے چلے گئے۔ آج نہ وہ ہیں، نہ وہ جن کے لیے وہ کام تھے، اور نہ ہی وہ کام۔ مگر اگر کچھ ہے تو بس ایک افسوس کہ زندہ تھے تو جیے نہیں، اور مر کر بھی بچے نہیں۔

مجھے لگتا ہے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ کچھ کرو یا نہ کرو، دو کام لازمی کرو۔ ایک، ہتھیار چلانا سیکھ لو، لڑنا سیکھ لو، اور دوسرا، جینا سیکھ لو۔

مجھے کچھ لوگ یاد آتے ہیں جاپان کے، جن پر ایٹم بم چلا تھا۔ جب بچے اپنے اسکول کا کام کرنے جا رہے تھے، ایک جوان نوکری کی فکر میں بیٹھا تھا، اور ایک بوڑھا کھانس رہا تھا۔ ایک مریض ہسپتال میں درد سے کراہ رہا تھا، اور اچانک ایک دھماکہ، اور سارے خواب ختم۔ سب کچھ ایک لمحے میں درہم برہم، اور بچا تو بس ایک راکھ کا ڈھیر۔

اور وہ افسوس کہ لڑ کر جنگ روک نہیں سکتے تھے، اور فکروں میں جی نہیں رہے تھے۔ ایک لمحے نے لاکھوں لوگوں کی زندگی ختم کر دی۔ کاش کہ ہم سمجھیں اور جی لیں، اور سمجھ جائیں کہ ہم نے واپس نہیں آنا۔ ایک دفعہ اس دھوکے میں

بھی جی لیں کہ اس دھوکے میں بھی ایک ہنسی ہے، وہ ہنسی ہنس لیں، ورنہ مرنے کے بعد ہنس نہیں پائیں گے اور افسوس کریں گے کہ کاش جی لیتے، جی لیتے۔

میری کلاس میرے سوالوں سے بہت تنگ ہے، اور میں سوال اس لیے اٹھاتا ہوں کہ لوگ سمجھیں کہ جو کچھ وہ سیکھ رہے ہیں، ان میں کتنی باتیں فضول ہیں۔ مگر یہ دنیا کا اصول رہا ہے کہ جو ان کی خیر خواہی سوچتا ہے وہ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

میرے سوالوں پر سب طعنے مارتے ہیں، وہ یہاں تک کہ میرے سوال سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں، سب ہی رولا ڈال دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے میں نے اپنے ایک سر سے سوال کرنے لگا تو رولا ڈل گیا۔ سر نے کہا، مجھے کوئی مسئلہ نہیں، مگر ان میں سے کوئی بھی آپ کو بولنے نہیں دینا چاہتا۔

خیر، پھر وہ چلے گئے۔ آج ان کا لیکچر تھا۔ میں نے ان سے جا کر کہا کہ میں نے سوال آپ سے پوچھا تھا، ان سے نہیں۔ انہوں نے کہا، آج ہم لیکچر آپ کے سوال سے ہی شروع کریں گے۔

انہوں نے پہلے کچھ باتیں کیں، پھر کہا کہ ہمارے ایک ساتھی نے ہم سے گلہ کیا ہے، تو آج ہم ان کے سوال سے ہی شروع کریں گے۔ مگر پھر وہی رولا۔ مگر میں اونچا بولا تو لمحے بھر کے لیے خاموشی ہو گئی، اور میں نے اسی دوران اپنا سوال ڈال دیا۔

سوال یہ تھا کہ اگر ضیاء الحق نے اسلام کے قانون لانے کا دعویٰ کیا تھا تو بھٹو کی پھانسی کون سے اسلام کے قانون کے مطابق تھی؟ خیر، انہوں نے اس بات پر تبصرہ کیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ سر خود بھی کچھ جگہ غلطی کر رہے ہیں۔ بہر حال، ایک بات انہوں نے ٹھیک بول دی کہ کوئی بھی اسلام کے قانون کے مطابق نہیں تھا۔ وہ دیکھنے میں کچھ اور تھا اور تھا کچھ اور۔

پھر انہوں نے بھٹو پر بات کرتے کرتے کہا کہ آپ لوگ بھٹو کی پانچ خوبیاں اور پانچ خامیاں لکھیں۔ پھر بچوں نے کہا نہیں، نہیں۔ پھر سر نے کہا، اچھا تو آپ اپنی پانچ پانچ خوبیاں اور خامیاں لکھیں۔

میں نے کاغذ اور قلم سے ایک منٹ میں اپنی پانچ خوبیاں اور پانچ خامیاں لکھ دیں۔ سر پیچھے کی طرف آئے اور پھر مجھے دیکھ کر کہنے لگے، لکھ لیا ہے؟ میں نے کہا، ہاں جی۔ انہوں نے میرا پیپر پڑھا اور پھر واپس کر دیا اور آگے چلے گئے۔

پھر انہوں نے کہا کہ آپ سنائیں گے؟ میں نے کہا، سر آپ نے پڑھ تو لیا ہے۔ سر نے کہا، سب کو سناؤ۔ میں نے اپنی پہلی خامی سنائی کہ میں لوگوں کو بہت تنگ کرتا ہوں۔ اس پر سر نے کہا کہ وہ تو سب کو پتا چل چکا ہے، اور یہ بات درست بھی ہے۔

میں الفاظ کو گھما کر سامنے والے آدمی کو ایک سائیکل میں پھنسا لیتا ہوں اور پھر اس سے سوال پر سوال کرتا چلا جاتا ہوں، اور وہ کنفیوز ہو جاتا ہے۔ مگر میں اس کو غلط نہیں سمجھتا اور نہ اس کو خامی سمجھتا ہوں، بلکہ یہ خامی دوسروں کی نظر میں ہے۔

پھر میں نے کہا کہ میں جھوٹ بولتا ہوں، اور یہ بات سچ ہے کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کہ میں بات کو بڑا بنانا بھی جانتا ہوں۔ اور میں نے کہا کہ میں جیسا نظر آتا ہوں ویسا نہیں ہوں، اور یہ بات بھی سچ ہے۔

لوگ میرے بارے میں اسی لیے کنفیوز ہو جاتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پاتے کہ آیا میں اچھا ہوں یا برا، سمجھدار ہوں یا بے وقوف، علم والا ہوں یا بے علم۔ کچھ مجھے مذہبی سمجھتے ہیں اور کچھ سیکولر۔ میں نے ہر ایک کے ساتھ الگ طرح کا رویہ رکھا ہے، اس لیے کوئی میرے بارے میں ایک اٹل فیصلہ نہیں کر پاتا۔

اپنی کلاس والوں کے رویے پر کبھی تو مجھے خود بھی ہنسی آتی ہے اور کبھی میں اداس بھی ہو جاتا ہوں کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ مگر یہ صرف کلاس نہیں، ہر جگہ یہی ایسے ہے۔

میں نے اندازہ لگایاہے کہ مجھے ایک نارمل دماغ والا بندہ نہیں سمجھ سکتا۔ میری باتوں کو سمجھنے کے لیے بہت تیز دماغ چاہیے۔ نارمل دماغ والا بندہ میرے بارے میں جو اندازہ لگائے گا وہ غلط ہو گا، کیونکہ جتنی دیر میں وہ میری ایک بات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، میں اس سے تیز ساری باتیں بدل دوں گا۔ میں بہت تیزی کے ساتھ ساری بات کو پلٹ کر کہیں سے کہیں کر دوں گا۔

مگر ان ساری باتوں کے باوجود، میں اس وقت تنہا محسوس کر رہاہوں۔ اور میں یہ بھی جانتاہوں کہ میں تنہاہونے کے ڈر سے تنہائی محسوس کر رہاہوں۔ مجھے تو چاہیے کہ سب سے تعلق توڑ کر تنہاہو جاؤں اور صرف ضرورت کی بات کروں۔

2025/12/14

آج میں نے زندگی میں پہلی دفعہ خون دیاہے۔ مجھے پہلے سے تھوڑی تھوڑی کمزوری محسوس تو ہو رہی ہے، مگر مجھے کسی قسم کے چکر نہیں آئے تھے، حالانکہ عام طور پر لوگوں کو چکر آجاتے ہیں۔

میں نے پرسوں مس آمنہ کا اسٹیٹس دیکھا، جس پر کسی کا نمبر لکھا تھااور لکھا تھا کہ اے پازیٹو بلڈ کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے اوکے کا میسج کر دیااور اس نمبر پر فون کیا۔ اس بندے کو بتایا کہ میرا اے پازیٹو بلڈ ہے

2025/12/17

آج کا دن بہت برا تھامیرے لیے، مگر ایک بات جو میں نے آج جانی وہ یہ تھی کہ واقعی برے دن بھی جینے بہت ضروری ہیں۔ اور ایک بات میں آج پھر سمجھ گیا کہ میرے سے لوگوں کے گلے شکوے اس دن ختم ہو جائیں گے جس دن میں نہیں رہوں گا۔

مجھے کچھ جملے بہت اچھے لگتے ہیں:

دائم و آباد رہے گی دنیا، ہم نہ ہوں گے، کوئی ہم سا ہو گا۔

میں پیغام دینا چاہتا ہوں ہر اس شخص کو جو مجھ سے نفرت رکھتا ہے، مجھے اچھا نہیں سمجھتا۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دن میں نہیں رہوں گا، میں اپنے ساتھ تمہارے سب گلے لے جاؤں گا، اور سوچوں گا کہ کیا تمہارے گلے ٹھیک تھے۔ تم بھی بیٹھ کر سوچنا، کیا تمہارے گلے بھی ٹھیک تھے۔

تم چیزوں کو اپنے مطابق دیکھتے ہو، کبھی میرے مطابق بھی دیکھو۔ کبھی میرا نظریہ بھی دیکھو، کبھی تم چیزوں کو میری آنکھ سے بھی دیکھو اور سوچو۔ میں بھی سوچوں گا۔

ایک جملہ اور جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ ایک دن ہم بھی مر جائیں گے، سارے گلے شکوے ختم ہو جائیں گے۔

اے لوگو جو مجھ سے نفرت رکھتے ہو یا مجھے برا سمجھتے ہو، میں اپنے ساتھ سارے گلے شکوے جب لے جاؤں گا، اس وقت تم اس سے آزاد ہو جاؤ گے اور تم مجھ سے بھی آزاد ہو جاؤ گے۔ تم مجھے برا بھلا کہو، جتنا مرضی کہو، جتنا مرضی میرے دنیا سے جانے کے بعد بھی کہو، میں تمہیں کبھی ٹھیک نہیں کرنا چاہوں گا، مرنے کے بعد تو بالکل بھی نہیں کر سکوں گا۔

اور اگر کر بھی سکتا تو کیسے کرتا؟ جن کو میں زندگی میں راضی نہ کر سکا، ان کو مرنے کے بعد کیسے کر سکتا؟ اور زندگی میں راضی نہیں کروں گا، کیونکہ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں کیوں راضی کروں۔

میری ساری تکلیفیں میں نے برداشت کی ہیں، تو مجھے پورا حق ہے کہ میں اپنی خوشیاں بھی اکیلے انجوائے کروں۔ میں کامیاب ہوں یا نہیں، میں نہیں جانتا، مگر ایک بات جانتا ہوں: میں الگ ہوں، اور بہت الگ، اور میرے جیسا کوئی نہیں۔

2025/12/19

میں ایک بات تک بہت بہترین پہنچ گیا ہوں کہ میں الگ ہوں، بہت الگ، مگر الگ کیوں ہوں، مجھے خود نہیں پتا۔ سارے میرے سے پہلے ناراض ہوتے ہیں اور پھر غصہ ہو جاتے ہیں۔ میں قابلِ نفرت ہوں، اور شاید مجھے قابلِ نفرت ہونا بھی چاہیے، کیونکہ میں ہوں ہی ایسا، الٹے ذہن کا مالک۔ اور میں الٹے سیدھے سوال بھی کرتا ہوں، اور میں تنگ بھی بہت کرتا ہوں۔ پہلے اچھا بھلا بندہ مجھ سے ناراض ہوتا ہے، پھر مجھ سے نفرت رکھ لیتا ہے۔ اب میں کیا کروں؟ ٹھیک ہے، کوئی رکھتا ہے تو رکھے، مجھے کوئی فکر نہیں، کیونکہ فکر کرنے سے میرا ہی وقت ضائع ہوتا ہے۔ میں چیزوں کو مکمل طور پر انجوائے کرنا چاہتا ہوں، پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

لوگ ڈرتے ہیں قانون توڑنے سے، مگر میں کوئی قانون فالو نہیں کرتا۔ میں سارے قانونوں سے عاری ہوں، کیونکہ وہ قانون نہ تو میں نے بنائے ہیں اور نہ میں ان کے حق میں ہوں۔ میں نے مرنا ہے، پھر میں کیوں ہی کوئی قانون فالو کروں؟ میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو قانون پر سختی سے عمل کرتے ہیں، کیا جنہوں نے وہ قانون بنائے ہیں، وہ خود ان پر عمل کرتے ہیں؟ قانون صرف دھوکا دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تو اے مجھ سے نفرت کرنے والو، مجھ سے جی بھر کر نفرت کرو، کیونکہ تم مجھ سے صرف نفرت ہی کر سکتے ہو، اور کچھ نہیں۔

میں بتاؤں، میں کوئی خاص انسان نہیں ہوں، مجھ میں کوئی خاص بات بھی نہیں۔ میں بالکل عام انسان ہوں۔ اور میں بتاؤں، میں کوئی بہت پیارا بھی نہیں ہوں، اور نہ مجھ سے خوشبو آتی ہے، اور نہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس پر میں رشک کر سکوں۔ میرے ہاتھ پاؤں خالی ہیں، اور نہ میں کوئی امیر زادہ ہوں، اور نہ میں کسی کو خوش کرتا ہوں، اور نہ میں کوئی سچا انسان ہوں۔ میں تو دھوکے باز بھی ہوں، ڈرامے باز بھی، اور جھوٹ تو شیطان نے مجھ سے سیکھا ہے۔ میں تو جھوٹ بھی بڑا پکا منہ بنا کر بولتا ہوں، اور میں گالیاں بھی نکالتا ہوں، اور نہ میں کوئی نفس کا پاک صاف انسان ہوں۔

میرے میں ہر وہ برائی ہے جو ایک عام انسان میں ہوتی ہے، پھر بھی میں خود سے پیار کرتا ہوں اور اپنی ہر برائی چھپاتا ہوں۔

میں ایک بات سوچتا ہوں کہ یار، ہم جو جی رہے ہیں، کیا وہ واقعی ہی کوئی زندگی ہے؟ روز صبح اٹھنا، کھانا کھانا، کام پر چلے جانا، ٹائم پر پہنچنا، اسکول جانا، کالج جانا، یونیورسٹی جانا، فیکٹری چلے جانا، دفتر چلے جانا—یہ کوئی زندگی ہے؟ ایسا تو جانور بھی کر رہے ہیں، اور ہم سے اچھا کر رہے ہیں۔ ایک پھول بھی جی رہا ہے، وہ تو کھل بھی جاتا ہے، ہم تو کھلتے بھی نہیں۔ ان سے تو خوشبو بھی آتی ہے، ہم سے تو وہ بھی نہیں آتی، آتی ہے تو صرف بدبو۔

زندگی کیا ہے؟ اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے، اور اس کو جینا تو اس سے بھی مشکل۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہماری زندگی کے نوے پرسنٹ مسئلے کوئی مسئلے ہی نہیں ہیں، وہ تو جان بوجھ کر بنائے ہوئے ہیں۔ جیسے بچے کو مسئلہ ہے کہ ہوم ورک کرنا ہے، بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے؟ جان بوجھ کر بنایا ہوا مسئلہ۔ کسی سے کوئی ناراض ہے، اس کو منانا ہے، یہ بھی بھلا کوئی مسئلہ ہے؟

جب انسان یہ سمجھ جاتا ہے کہ نہ کہیں جانا ہے، نہ کچھ پانا ہے، تب انسان سکون میں ہو جاتا ہے۔ میں بتاؤں، ایک انسان جب سگریٹ پیتا ہے، نشے والا، اس وقت سارا دماغ چپ کر جاتا ہے اور کوئی سوچ نہیں بچتی۔ انسان اپنے آپ میں مگن ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کو ہی جاہل کہا جاتا ہے۔ مجھے تو ایسے لوگ سمجھدار لگتے ہیں، کم از کم وہ تمہارے جیسے دکھوں سے تو آزادی حاصل کرتے ہیں۔

مگر وہ لوگ جو خود میں ہی مگن رہتے ہیں، لوگ ان کو پاگل کہتے ہیں، مگر تم کو کیا معلوم، وہ پاگل تم سے بہت بہتر ہیں۔ ان کی ساری خواہشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی خواہش کو ختم کرنا ہی خواہش ہوتی ہے۔ وہ ٹینشن سے آزاد، بہت بہتر ہیں۔ مگر

ہم لوگ ٹینشن میں جینا سیکھنا چاہتے ہیں، اور ٹینشن ختم کرنا بھی چاہتے ہیں، مگر جو تم سیکھ رہے ہیں، وہاں ٹینشن رہیں گی۔ تم جو مرضی کرلو، وہ نہیں ختم ہوں گی۔ تم ہی بے وقوف ہو، تم دو چیزیں جو بالکل متضاد ہیں، ایک ساتھ مانگتے ہو۔

میں صرف قانون کے خلاف نہیں ہوں، میں روایات کے بھی خلاف ہوں۔ جیسے جب میں چھوٹا ہوتا تھا، سارے میرے پر پریشر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے، چھوٹے بال رکھنے پر۔ بچپن میں ہماری ٹیچر ہمیں کہتی تھی کہ بڑے بال تو لڑکیوں کے ہوتے ہیں۔ اور میں سوچتا تھا کہ کیوں؟ صرف لڑکیاں ہی بڑے بال کیوں رکھتی ہیں؟ لڑکے بڑے بال کیوں نہیں رکھ سکتے؟ اس سے کیا ہوتا ہے؟

اور مجھے تو یہ روایات بڑی فضول سی لگتی ہیں کہ لڑکے چھوٹے بال رکھیں گے اور لڑکیاں بڑے بال۔ کیوں؟ لڑکیاں کیوں لڑکوں جیسے بال نہیں رکھ سکتیں، اور لڑکے کیوں لڑکیوں جیسے بڑے بال نہیں رکھ سکتے؟ یہ تو پسند کی بات ہے۔ اگر قدرت نے ہمیں ایسا بنایا ہے تو کیوں ہم ایسا فضول سوچتے ہیں؟ اگر قدرت چاہتی تو میرے بال خود ہی روک دیتی۔

یہ کیا فضول سی باتیں ہیں۔

میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں اپنی خوشیاں بھی کسی کو نہیں دوں گا۔ جیسے کوئی میرا دکھ نہیں لینا چاہتا، وہ میری خوشیاں بھی نہ لینے آئے۔

2025/12/25

ابھی اس وقت رات کے تین بجنے والے ہیں اور میں بہت گہری سوچ میں پڑا ہوا ہوں۔ کچھ باتیں آج میری پختہ ہو گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ کی وجہ میں نہیں لکھوں گا، کیونکہ اگر میں نے وہ وجہ سچ سچ لکھ دی تو ہو سکتا ہے کہ یہ ڈائری، اگر میں پبلش کر دوں، تو کچھ لوگوں کے لیے زندگی بھر کا مسئلہ بن جائے۔

ایک بات میں نے آج جانی ہے کہ زندگی میں کبھی کبھی برے لوگ بھی اتنے ضروری ہوتے ہیں جتنے کبھی کبھی اچھے لوگ۔ ویسے ایک سچ بات کہوں تو برے لوگ زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ میں نے ایسے مولوی بھی دیکھے ہیں جن کی مسجدوں میں اگر کوئی بچہ پیشاب کر دے تو رولا ڈال دیتے ہیں، یہ ہو گیا، وہ ہو گیا۔ میں جاننا چاہتا ہوں، آخر کیا ہی ہو گیا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ بچہ ہے، اس کو کہاں اتنی سمجھ، اور کہاں اس بے صبرے سے صبر ہو سکتا تھا۔

اور دوسری طرف میں نے شراب پینے والے لوگوں کو بھی دیکھا ہے۔ شراب نوشی کے وقت ایک دوسرے کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اگر کسی کو زیادہ نشہ چڑھ جائے تو اس کو الٹی آ جاتی ہے، اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس پر گھن دکھا رہے ہوں۔ وہ تو کندھے پر اٹھا کر اس کی مدد کرتے ہیں، اسے واش روم تک لے کر جاتے ہیں اور اس کو الٹیاں کرواتے ہیں تاکہ اس کی طبیعت سنبھل جائے۔ ایک دوسرے کی الٹیاں صاف بھی کر دیتے ہیں، ایک دوسرے کے عیب پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مگر میں نے یہ ہمت معاشرے کے باکردار آدمیوں میں بھی نہیں دیکھی۔

میں اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ اپنے سینیئرز کے ساتھ نہ بناؤ۔ یہ فائدے سے زیادہ نقصان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں سانپوں والی خصوصیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اکثر میری ان باتوں کا مذاق بناتے ہیں، مگر آج ایک واقعے سے میری بات سچ ثابت ہوئی ہے۔ وہ کیا ہے، نہ تو میں وہ بتا سکتا ہوں اور نہ میں وجہ بیان کر سکتا ہوں۔ بس ایک بات ہی بولوں گا کہ سینیئرز سے دوری بہت بہتر ہے۔ ہاں، ان سے بناؤ جو تمہارے کلاس فیلو ہیں۔ انہوں نے تمہارے ساتھ ہی رہنا ہے، سینیئرز نے جلدی چلے جانا ہے، تو وقت رہتے سمجھ جاؤ۔

خیر، اس وقت میں جس چیز سے متعلق سوچ رہا ہوں، وہاں مجھے سو کالڈ برے لوگ ہی ٹرسٹڈ پرسن لگ رہے ہیں جن سے میں اپنا مسئلہ کھل کر شیئر کر سکتا ہوں۔ اور وہ لوگ جو بظاہر میری زندگی میں اچھے لوگ شمار ہوتے ہیں، ان پر ٹرسٹ

نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی سیدھی بات کہوں تو مجھے اس وقت ان برے لوگوں کی ضرورت ہے، کیونکہ وہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ باقیوں پر بھروسہ کرنا اتنا خطرناک ہے کہ اگر ان پر بھروسہ کر لیا جائے تو کسی کی زندگی کا خطرہ بن سکتا ہے۔
کتنی عجیب بات ہے، مگر ہاں، یہ عجیب بات اتنی ہی سچ ہے جتنی سورج کا روز مشرق سے طلوع ہونا۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ان اچھے لوگوں کا نام برا رکھ دینا چاہیے اور برے لوگوں کا نام اچھا۔ مجھے وہ بات بہت یاد آتی ہے کہ لوگوں سے ان کے جھوٹ نہ چھینو، ورنہ وہ مر جائیں گے۔ لوگوں کو ان کے جھوٹ میں جینے دو، کیونکہ یہی جھوٹ ان کی زندگی کا واحد سہارا ہے۔
کتنی ہمت ہے ان برے لوگوں میں کہ برے کہلوائے جاتے ہیں، پھر بھی برا محسوس نہیں کرتے۔ اور اگر ان سو کالڈ اچھے لوگوں کو آئینہ دکھا دیا جائے کہ اصل برے تو تم ہو، تو خودکشیوں کی دھمکیاں، اور اکثر کر بھی لیتے ہیں۔ اور پھر وہی پروٹیسٹ کہ یہ ہو گیا، وہ ہو گیا، تمہاری سوچ خطرناک ہے۔ سوچ خطرناک نہیں، بلکہ وہ سوچ سچ ہے۔ تم میں ہمت نہیں کہ حقیقت کو تسلیم کر لو، مگر تم تو بس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے دعوے کرتے ہو۔
تمہیں لگتا ہے لوگ تم پر بھروسہ کرتے ہیں؟ نہیں، بلکہ وہ بھی تم سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اپنے الفاظ یا کردار پر غور کرنا بند کرو، بلکہ حقیقت پر غور کرو کہ تم کہاں ہو۔ اور وہ حقیقت والا جھوٹ نہیں جو لوگ تم سے بیان کریں۔ لوگ تو تم سے جھوٹ بولیں گے کہ نہیں، تم تو اچھے ہو، نمازیں پڑھتے ہو، یہ کرتے ہو، وہ کرتے ہو۔
تم کچھ بھی نہیں، صرف دھوکہ دیتے ہو، اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی۔ اور اس سے بڑا افسوس یہ کہ تم کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ اکثر علما وغیرہ جانتے ہیں کہ یہ معاشرہ کیسا ہے، مگر پھر وہ ایسا فتویٰ دیتے ہیں جو علمی طور پر تو ٹھیک ہوتا ہے، مگر عملی طور پر نقصان کے علاوہ کچھ نہیں۔

جیسے ایک کنواری لڑکی کی مثال لے لو۔ اس نے غلط کام کر لیا اور اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اگر یہ بات معاشرے کو پتا چل گئی تو وہ تو اسے جان سے مار ڈالیں گے، ماں باپ خود اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔ اور اگر ایسا نہ کریں تو اس کی زندگی جہنم سے بدتر بنا دیں گے۔ اور پھر شادی کے بعد شوہر، اور اکثر جگہ تو شوہر خود ہی اس کو جان سے مار ڈالے گا۔

ایسے موقعوں پر ابورشن ایک حل ہے، مگر یہاں علما فتویٰ دیتے ہیں کہ ابورشن گناہ ہے، بچے کی جان لینا گناہ ہے، یہ ہے، وہ ہے۔ تو کیا اس لڑکی کی زندگی جہنم بنانا ثواب ہے؟ کیا اس کی جان کی کوئی قیمت نہیں؟ پھر کہیں گے کہ نہیں، ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ بھی گناہ ہے۔ تو یہ کیا؟ تم نہیں جانتے کہ تمہارے معاشرے میں ایسا کچھ ہوتا ہے؟ اسے تو تم روک نہیں سکے، اس پر تو بس تنقید ہی کرتے ہو، وہ بھی چند مشہور جملے، بس، اور کچھ نہیں۔

تم سب سچ جانتے ہو، پھر بھی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہو۔ پھر کہتے ہو کہ اس نے یہ کام ہی کیوں کیا؟ اب ہو گیا، اب کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا اب جو ہو سکتا ہے، اس پر تو تم غور نہیں کرتے۔

کیا تم میں اتنی جرات ہے کہ تم ایسی لڑکی سے شادی کر کے اس کی زندگی پھر سے باغوں والی کر دو؟ اگر اتنی ہمت نہیں، تو تمہاری بڑی مہربانی، اگر کسی کی زندگی باغوں والی نہیں کر سکتے تو اس کو جہنم بھی نہ بناؤ۔ اپنے فتوے اپنے پاس رکھو، ان سے بہت نقصان ہو چکا ہے۔

2025/12/26

ابھی اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں، اور آج میں نے یہ چیز سیکھی ہے کہ ہماری زندگی میں کئی چیزیں، کئی لوگ ایسے ہیں جن کے ساتھ رہنا، جن کو ساتھ رکھنا مجبوری ہے۔ اور اس کے فائدے بھی ہیں، مگر ان کے نقصان بھی بہت ہیں، اور شاید وہ مجبوری کا نقصان زیادہ بھاری ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔

کبھی کبھی وہی لوگ جو مجبوری کے وقت ساتھ ہوتے ہیں، ان کا نقصان نہیں بھولتا، چاہے اس کے فوائد بہت زیادہ ہوں۔ جیسے مثال کے طور پر جوان اولاد۔ میں نے ان سے زیادہ مجبور کوئی نہیں دیکھا جو نہ ادھر کی ہوتی ہیں نہ ادھر کی۔ ان کے لیے ان کا ہی گھر جہنم سے بدتر ہو جاتا ہے۔

ایک تو اس کو ساری زندگی وہ پڑھاتے ہیں جس کا فائدہ نہیں، اور فائدے کی چیز کے سوال پر مار دھاڑ۔ اور پھر ان سے یہ ایکسپیکٹ کرنا کہ وہ بدلے میں کوئی فائدہ مند کام کرے گا۔

ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بے فضول جگہ ان کا وقت خود ضائع کروا کے، ان کے کھیل چھین کے، ان کو الگ الگ جگہ جانے سے روک کے، ان کے اندر کونفیڈنس مانگنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے؟ دوسروں سے کمپئیر کر کے ان کو نیچا دکھا کے ان سے اچھے سلوک کی امید لگانا خود کو دھوکہ دینے والی بات ہے۔

ان کی جوانی کا جنازہ نکال کے اپنے بڑھاپے کو اچھا مانگنا بے وقوفی ہے۔ معاملات میں ان کی بات سنے بغیر اگلے کی بات پر یقین کر کے ان کو سزا دینا، اور مجمع میں بیٹھ کر ان کو نیچا کر کے یہ کہنا کہ یہ کرے گا، کیسے نہیں کرے گا، اگر نہیں کرے گا تو مار کھائے گا، گھر سے نکال دوں گا—یہ باتیں کر کے لوگوں سے داد لے کے اپنے بڑھاپے کو سیو کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

خود بھی ان چیزوں کے لیے تیار رہو۔ آج نہیں تو کل وہ کمانے لگ ہی جائے گا۔ وہ وقت کا سوچو جب تم اس کے ہی محتاج ہو جاؤ گے، تب وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

وہ تو تمہیں اٹھا کر اولڈ ایج ہوم میں چھوڑ آئے گا۔ ایسے کرنے پر ایسا ہی ہو گا۔ آزادی کی سوچ پیدا کرنے کے بعد غلامی میں جیوانا اپنی بربادی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ آزادی کی سوچ اور غلامی کبھی اکٹھی نہیں چل سکتی۔

اور ان سب کے باوجود سب سے بڑا افسوس یہ ہے کہ کئی لوگ ان باتوں کو سمجھ کر واہ واہ کر دیتے ہیں، مگر عمل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب رٹی رٹائی باتیں ہیں۔ پھر جب ان کو فریب پڑھا کر حقیقت سے آشنائی ہو، تو تم پر لعنت بھری آہ ہے، اور اس سے بڑھ کر تمہارا اپنی غلطی تسلیم بھی نہ کرنا ہے۔

ایک بات پر اکڑ کر کھڑے ہو جانا کہ جو تم نے سنا وہ مان لیا اور اسی پر جم گئے — لگے رہو، کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ آخری نتیجہ ہی تم کو سب کچھ آشنا کروا دے گا۔ اس کے لیے تیار رہو۔

2025/12/27

ابھی اس وقت صبح کے چار بجنے والے ہیں، اور میں ڈر کر اٹھ گیا ہوں۔ میری آنکھ کھل گئی ہے۔ بڑا ہی خطرناک خواب دیکھا ہے، اور اس خواب کو دیکھ کر مجھے سارے ملزموں پر ترس آ رہا ہے جن کے ساتھ برا ہوتا ہے۔ میں ان کا سہارا بنوں گا اور انہیں بچاؤں گا۔

میں نے دیکھا کہ ہم تین دوست، میں، حنین اور سمعی، کسی جگہ پر تھے اور ہم کسی ٹی وی چینل کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی تلاش میں تھے کہ وہ کہاں سے ملتے ہیں۔ خیر، حقیقت میں تو میں سمعی سے ناراض ہوں، مگر خواب میں میں نے دیکھا کہ ہماری صلح ہو گئی ہے۔ ہم کبھی ادھر جا رہے ہیں، کبھی ادھر۔ خیر، کرتے کرتے ہم ایک جگہ پہنچے تو اس نے ہمیں کہا کہ ساتھ والی جگہ پر چلے جاؤ، اور کہا کہ باہر "نائیوت" لکھا ہو گا۔ ہم نے دیکھا، وہاں یہی لفظ لکھا تھا۔

ہم نے دروازہ بجایا اور ایک بندہ آیا، اور ہم اندر چلے گئے۔ اندر کافی سارے لوگ تھے۔ ان کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ یہ حکومتی، پولیس ٹائپ لوگ ہیں، مگر ان کی وردی کچھ عجیب تھی۔ میں نے ایسی وردی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ ان کی وردی نیلی تھی اور وہ سب کے سب تیار ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا انہوں نے اپنے بڑے افسر کو بلایا۔ وہ بڑا سخت مزاج تھا۔ خیر، وہ اندر کے کمرے سے باہر آیا، چلتے چلتے اپنی یونیفارم ٹھیک کر رہا تھا۔ نیلی شرٹ تھی اور کچھ گہرے رنگ کی پینٹ،

اور اوپر اس نے پھٹی نظر آنے والی براؤن رنگ کی جرسی پہنی تھی، جس پر اور بھی گہرے رنگ کے بہت سارے پیوند لگے تھے، مگر وہ جرسی بالکل ٹھیک تھی، بس نظر ایسی آتی تھی۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ چینل وغیرہ کہاں سے لگ سکتے ہیں۔ اس نے ہمیں کہا کہ میں تمہیں بتا سکتا ہوں، مگر کل بتاؤں گا۔ اس کے بدلے میں تمہیں مجھے شکریہ کہنا ہوگا اور ایک کس دینی ہوگی۔ ہم اس کا مقصد بھانپ گئے کہ وہ ہم سے گندا کام مانگ رہا تھا، اور خاص طور پر سمعی سے۔ ہم نے کہا کہ نہیں، ہمیں نہیں چاہیے، اور ہم جانے لگے۔ تو اس نے سمعی کو کھینچ کر زبردستی کس لے لی۔ ہمیں غصہ آگیا اور ہماری جھڑپ ہوگئی۔ خیر، اس کو ہم سے مار پڑی یا نہیں پڑی، یہ یاد نہیں۔

خیر، اس نے آواز دی کہ پکڑلوان کو۔ ہم نے دوڑ لگا دی۔ اس نے سمعی کو پکڑ کر اسے زندہ ہی آگ لگا دی۔ میں اور حنین ڈر گئے اور ہم دونوں بھاگ نکلے۔ اس وقت شام ہونے والی تھی، جلد ہی رات بھی ہوگئی۔ ہم الگ الگ بازاروں سے بھاگتے بھاگتے نکلے، لوگوں کے ہجوم سے چھلانگیں لگاتے۔ کبھی ان کی نظر ہم پر پڑ جاتی اور وہ ہمارا پیچھا شروع کر دیتے۔ جب ہم نے دیکھا کہ زمین پر بھاگنا مشکل ہے تو ہم نے چھتوں سے نکلنے کا ارادہ بنایا۔

اب ہم دونوں چھپتے چھپتے چھتوں سے نکلنے لگے۔ جلد ہی وہ بھی ہمارے پیچھے آ گئے۔ خیر، ہم ایک گھر کی چھت پر پہنچے جس کی دیواریں ابھی کھڑی تھیں، مگر ایک دیوار اکیلی کھڑی تھی۔ میں اس کے پیچھے جا کر لیٹ گیا۔ دوسرے گھر کی چھت پر وہ سارے افسر آ گئے تھے۔ وہ وہاں ہمیں پکڑنے کی باتیں کر رہے تھے۔ دیوار میں ایک سائیڈ پر بڑا سا سوراخ تھا، میں وہاں سے دیکھ بھی رہا تھا اور ساتھ ساتھ چھپ بھی رہا تھا کہ کہیں ان کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ میں اپنے پاؤں بھی سمیٹ رہا تھا کہ کہیں آواز پیدا نہ ہو جائے۔

خیر، وہ ہمیں پکڑنے کے پلان بنا رہے تھے، اور میں سن رہا تھا۔ پھر وہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہاں ایک لڑکا آیا جو آس پاس کے کسی گھر کا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔ پہلے میں ڈر گیا، مگر پھر میں اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ حنین بھی پکڑا گیا ہے۔ وہ کہیں چھلانگ لگا کر جا رہا تھا اور انہوں نے اسے دیکھ کر پکڑ لیا ہے۔

خیر، اس لڑکے نے کہا میرے ساتھ آؤ، میرے پیچھے آؤ۔ ابھی اس نے چھلانگ لگا کر دیوار پر قدم رکھا ہی تھا کہ پولیس والا آ گیا۔ اس نے اس کو پکڑ لیا۔ اس کی نظر تو مجھ پر نہیں پڑی، مگر آوازیں آ گئیں۔ میں نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

خیر، بھاگتے بھاگتے میں گھر پہنچ ہی گیا۔ اندر آیا تو ماما بابا گھر نہیں تھے۔ گھر میں صرف اسامہ اور عبد الرحمن تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے پوری دنیا کو یہ بات پتا چل گئی ہے، اور اس افسر نے یہ بات اپنے حق میں پھیلا دی ہے، اور وہ ہمیں دہشت گرد دکھا رہا تھا۔ ماما بابا آئے تو انہوں نے بھی مجھے دہشت گرد ہی کنسیڈر کیا۔

میں نے بابا کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ کم از کم میری بات سن لیں، مگر وہ کہاں سننے کو تیار تھے۔ خیر، تھوڑی بحث کے بعد انہوں نے میری بات بڑے کرخت مزاج میں سن لی، مگر ان پر اصل حقیقت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں میں ہی غلط لگ رہا تھا۔

اتنی دیر میں مجھے فیلنگ آئی کہ پولیس باہر آ گئی ہے اور میرے فون سے لوکیشن ٹریک ہو رہی ہے۔ میں نے فون بند کر دیا، مگر ایک سوچ میں پڑ گیا کہ آخری لوکیشن تو گھر کی آ گئی ہے، اب ان کو مسئلہ نہ بن جائے۔ اتنی دیر میں باہر دروازہ بجا۔ میں بند کرنے کے لیے بھاگا۔ باہر دیکھا تو ایک بائیک پر دو لوگ بیٹھے نظر آئے۔ مجھ پر ان کی نظر پڑی۔ ایک بندہ اترا اور بھاگ کر مجھے پکڑنے کے لیے دوڑا، مگر میں نے دروازہ بند کر دیا۔

پہلے میں انہیں پولیس سمجھ رہا تھا، مگر جب وہ قریب آیا تو مجھے پتا چلا کہ یہ پولیس نہیں، بلکہ وہی بندہ ہے جس نے ہمیں نائیوت پر بھیجا تھا، جس نے ہمیں کہا تھا کہ ساتھ چلے جاؤ۔ وہ اور اس کی بیوی تھی۔ دروازہ بند ہونے پر وہ واپس بھاگا اور بائیک اسٹارٹ کر کے پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا، اور اسی خوف میں میری آنکھ کھل گئی۔

خواب کے دوران میں نے یہ بھی دیکھا کہ جب میں گھر پہنچ گیا تھا اور ماما بابا گھر نہیں آئے تھے، اس وقت حمزہ ہماری چھت پر آیا تھا۔ وہ رو رہا تھا، اس کے جسم پر لاٹھیاں پڑی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں سے خون نکل رہا تھا۔ مگر اس کے ساتھ کیا ہوا تھا، یہ معلوم نہیں۔ وہ اپنی چھت سے ہماری چھت پر آیا تھا۔

ان ساری باتوں کا مقصد اور مطلب مجھے معلوم نہیں، مگر یہ محسوس ہوا ہے کہ ملزموں کے ساتھ، جن پر زیادہ تر جھوٹے الزام لگتے ہیں، کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ جیسے ایک حالیہ کیس، مشہور ولوگر ڈکی کا ہے۔ ابھی اس وقت صبح کے نو بجنے والے ہیں۔ پرانا خواب لکھ کر میں پھر سو گیا تھا، اور ابھی اٹھا ہوں۔ اس دوران میں نے ایک اور خواب دیکھا، وہ بھی بہت عجیب تھا۔ میں نے خواب میں ایک بات جانی جس کا شاید مجھے پہلے بھی اندازہ تھا، وہ یہ کہ دنیا کا ہر گناہ تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ میں نے اس کی ایک شکل دیکھی، اور دیکھی بھی اپنے اوپر۔ میں نے دیکھا کہ میرے پرانے محلے کے کچھ دوست، علی، حسن، بلال اور میں کھڑے ہیں، اور بلال تکبر میں میرا چالان کر رہا ہے، پتا نہیں کیوں۔ اور میں اسے منع کر رہا ہوں، مگر پھر بھی وہ کر رہا ہے۔ خیر، مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا، تو کر، دل کھول کر کر، پھر تجھے بتاتا ہوں۔ خیر، اس نے مجھے 2630 کا چالان کر دیا۔ میں نے کہا، اب تو نہیں بچتا۔ ویسے یہ بہت عجیب تھا، میں حقیقت میں ایسا نہیں کرتا۔

خیر، وہ راغا کے گھر تھا، وہ بھی ہمارا ہی دوست ہے۔ اس کے گھر کے تین پورشن ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ میں اس کے گھر نیچے سے نہیں بلکہ اوپر سے نیچے کی طرف جا رہا ہوں۔ میں چھت پر چڑھا ہوں اور اب نیچے جا رہا ہوں۔ رات کا وقت

ہے، شور کی وجہ سے لوگ اٹھ کر آرہے ہیں، مگر مجھے دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ باتیں بھی کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں، اچھا تم ہو۔

تیسری منزل سے دوسری پر آیا تو میری ایک آنٹی سے ملاقات ہوئی جن کے بچوں کو میں نے کبھی پڑھایا تھا۔ پھر میں پہلی منزل پر آ گیا۔ اس دوران راغا کی کسی بزرگ خاتون سے بات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ بلال وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوتا ہے جس کے پاس کٹر ہے، اور جس دن اس کی بدبو زیادہ ہوتی ہے اس دن وہ لازمی وہاں بیٹھتا ہے۔

خیر، میں نیچے گیا، اور میرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ میں نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد میرے خلاف کیس بن گیا اور مجھے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ سارے ثبوت میرے خلاف ہیں، گواہی میرے خلاف ہے، میرا اپنا باپ میرے خلاف ثبوت ڈھونڈ رہا ہے اور گواہی دے رہا ہے۔ مجھے بتا دیا گیا کہ مجھے سزائے موت ہو گئی ہے۔ میں رو رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ مجھے عمر قید دے دو، سزائے موت نہ دو۔

خیر، میرا ساتھ صرف ایک بزرگ خاتون دے رہی تھیں جو فاطمہ جناح جیسی نظر آتی تھیں اور سمجھدار بھی تھیں۔ میرا وکیل کہہ رہا تھا کہ ایک مقرر وقت پر دونوں جنازے آ جائیں گے، ایک میرا اور ایک بلال کا۔

میں نے اپنے وکیل کو ایک عجیب سا قانون بتایا، جو میری نظر میں کارآمد تھا۔ میں نے کہا کہ اگر میں مکر جاؤں اور کہوں کہ جب میں وہاں پہنچا تو قتل پہلے ہی ہو چکا تھا، تو کیس ایک اور طرف چلا جائے گا اور دوبارہ ٹرائل شروع ہو جائے گا۔ ان بزرگ خاتون نے میری بات پر سوچا۔ اندر سے وہ مجھ سے ناراض تھیں، مگر پھر بھی میرا ساتھ دے رہی تھیں۔

پھر میں نے دیکھا کہ جج نے ہمارے پرانے محلے کی سب سے تیز طرار آنٹی سے بات کی اور کہا کہ یہ کیس الجھا ہوا ہے، اس لڑکے کو کل تک بری کر دیا جائے گا، سزائے موت نہیں ہو گی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے والد میرے خلاف ثبوت جمع کرنے کے لیے ایک گھر میں داخل ہوئے اور کچھ ایکسپیرمنٹ کرنے لگے، اور اسی پر میرا خواب ٹوٹ گیا۔

اب اس وقت دو بج کر چوبیس منٹ ہو رہے ہیں، اور ایک بات کی اور تصدیق ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس شخص کی رات جتنی مشکل ہوتی ہے، اس کی صبح اتنی ہی آسان ہوتی ہے۔ اگر کسی نے خواب میں خود کو روتے دیکھا ہو تو وہ اگلے دن ہنستا ہے، اور جس نے خود کو ہنستے دیکھا ہو وہ اگلے دن روتا ہے۔

ایسا ہی ہوا۔ جب میں صبح اٹھ بیٹھا تو مجھے میری سٹوڈنٹ کا میسج آیا۔ اس نے کہا، "معیظ بھائی، رزلٹ آگیا ہے۔" میں نے کہا، "اچھا، بتاؤ کیا آیا ہے؟" اس نے کہا، "77 نمبر آئے ہیں۔" اس کے پہلے فزکس میں نمبر 22 آئے تھے۔ پھر میں نے اس کی تیاری کروائی۔ تیاری میں وہ تھوڑی تنگ بھی پڑتی تھی، مگر میں اسے زبردستی کام کرواتا تھا۔ بائیو میں پہلے اس کے 35 تھے، اب 69 آئے ہیں۔ دونوں سبجیکٹس میں 85 میں سے نمبر تھے، یعنی واضح فرق۔ ویسے بھی 100 نمبر ہی امپروومنٹ میں بڑھ سکتے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ اس نے 89 نمبروں کی امپروومنٹ کی، اور یہ اس کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔

مگر لڑکیوں کی ایک بری عادت، اچھے نمبروں پر بھی خوش نہ ہونا۔ وہ مجھے کہتی ہے، "معیظ بھائی، میں ابھی بھی خوش نہیں ہوں۔" خیر، میں نے اس سے کہا، میں ہوتا تو شاید ایسا نہ کرتا، آپ کو تو ڈانس کرنا چاہیے۔ میں ہوتا تو خوشی سے چاہے مجھے ہارٹ اٹیک ہی آ جاتا، کیونکہ میں چیزوں کو بس ایک دفعہ پڑھتا ہوں، بار بار نہیں پڑھ سکتا۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور سٹوڈنٹ کا میسج آیا۔ اس نے کہا، "سر، میں میتھ میں پاس ہو گیا ہوں۔" مزے کی بات یہ ہے کہ مجھے خود میتھ آتی ہی نہیں۔ میں نے اسے مبارکباد دی۔ میری نانی امی کہتی ہیں، "اگر تجھے خود نہیں آتا تو پڑھایا کیسے؟" میں نے کہا ٹریک سے۔ ماما کہتی ہیں، "نہیں، ٹیچر تو یہ بہت اچھا ہے۔"

خیر، میرے سارے ہی سٹوڈنٹس پاس ہو گئے جو فیل ہوئے تھے۔ کسی نے مجھے یہ نہیں کہا کہ وہ فیل ہو گیا ہے۔

2025/12/28

ابھی اس وقت شام 5 بجے ہیں اور میں آج ایک جملہ پڑھ رہا تھا کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔" میں نے پہلے بھی بہت دفعہ یہ جملہ سنا ہے اور بولا بھی ہے، مگر کیا واقعی جو کچھ ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے؟ شاید نہیں۔ شاید جو کچھ ہوتا ہے، ہمیشہ اچھے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ ہوتا ہے، کچھ ہونے کے لیے، مگر شاید اگر کچھ نہ ہوا ہوتا تو کچھ ہونے کی بجائے کچھ اور ہو جاتا۔ شاید ہم بس یقین کر بیٹھے ہوں، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ شاید اچھا نہیں ہوا۔ ہم بس یہ جملہ بول کر خود کو دھوکہ دے رہے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک بچہ جو چھوٹے ہوتے کسی مہلک بیماری سے مر جاتا ہے، وہ ہوا تو کیا اچھے کے لیے ہوا؟ اب اس میں کچھ سے کچھ جو مرضی جوڑ لو، کہ بڑا ہو کر نافرمان بنے، کسی کا قتل کرے، وغیرہ وغیرہ۔

تو کیا وہ اگر مر گیا تو دنیا سے نافرمانی ختم ہو گئی یا قتل ہونا بند ہو گیا؟ یہ سب صرف جھوٹی تسلی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ کوئی کسی کی زندگی کا سہارا چھین کر اور بدلے میں اسے کہے کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔" جیسے ایک ٹیچر کسی کے نمبر کاٹ لے اور بولے کہ "جو کچھ ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔" لوگ کہتے ہیں نمبروں سے کیا ہوتا ہے؟ نمبر سے اس کا میرٹ خراب ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی اچھے ادارے کم ہیں اور جو بچے کچے ہیں، ان میں ان کا داخلہ نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ دل چھوڑ دیتے ہیں اور ان پڑھ رہ جاتے ہیں۔ جن کے پاس وسائل ہوتے ہیں، وہ باہر بھاگ جاتے ہیں۔ اور آخر میں یہ بات سنا دی جاتی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے، ہمیشہ اچھے کے لیے نہیں ہوتا۔ اچھے کے لیے جو کچھ ہوتا ہے، ہم اس پر خوشیاں مناتے ہیں، اور جو اچھے کے لیے نہیں ہوتا، ہم اس پر خوشیاں نہیں مناتے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اٹھاؤ ڈھول، ڈھمکے، اور کسی کے جنازے پر کھڑے ہو کر ناچو اور بولو "جو کچھ ہوتا ہے،

اچھے کے لیے ہو تا ہے!" اس بیٹے سے پوچھو، تمہارا باپ مر گیا، اب خوش ہو؟ جو کچھ ہو تا ہے، اچھے کے لیے ہو تا؟ پھر وہ تمہیں بتاتا ہے کہ کیسے جو کچھ ہو تا ہے، اچھے کے لیے ہو تا۔

میں تمہیں اپنی تحریر میں یہ نصیحت کر تا ہوں: جیسے جیسے تم آگے بڑھتے جاو، تم پچھلی باتیں بھول جاؤ۔ جو میں نے کل کہا تھا، وہ شاید غلط کہا ہو گا، مگر جو آج کہہ رہا ہوں، وہ صحیح ہے۔ کل جو آنے والا ہے، اس دن سنو۔ میں اس دن جو کہوں گا، وہ صحیح ہو گا۔ آج کا غلط ہو جائے، کیونکہ ہر لمحے میں بڑا ہو رہا ہوں، بدل رہا ہوں، تو میری باتیں بھی بدل جائیں گی۔ مگر مجھے سنو اور اپنے آپ سے سمجھو، میری باتوں پر اندھے ہو کر نہ چلنا۔ سوچو کہ جو کچھ میں نے کہا وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر صحیح ہے تو اسے اپنالو، اور اگر غلط تو چھوڑ دو۔ اپنے آپ سے سوچو، کیا واقعی جو کچھ ہو تا ہے، اچھے کے لیے ہو تا ہے؟

ابھی اس وقت 8:17 بج رہے ہیں اور میں اپنی ایک پرانی تصویر دیکھ رہا تھا، جس میں سوال کر رہا تھا آئین میں 27ویں ترمیم پر۔ اس میں بظاہر نہ خوش ہونے والی بات کوئی نظر نہیں آتی، کیونکہ کیا اس سے پہلے آئین کی روح کو پامال نہیں کیا جا رہا تھا؟ پہلے تو آئین کے خلاف بات ہو رہی تھی، اب تو مکمل طور پر انہوں نے اعلان کر دیا کہ ہم نے اس کام کو آئین کا حصہ بنا دیا ہے جو ہم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کرتوت فضول، اچھی اچھی باتوں والی کاغذی کاروائی میں شامل کر دیے اور سچ بیان کر دیا۔

میں اصل میں یہ بات کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں سچ چاہیے، مگر صرف ایک تصویر کی شکل میں۔ ہمیں اصل میں سچ نہیں چاہیے، اس لیے ہم اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ یہ تو کھلا تضاد ہے۔ خیر، میرے ساتھ بیٹھے میرے دوست نے اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، جیسے وہ اپنا چہرہ چھپا رہا ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں، کیا میرا اچھا ترین دوست بھی میری باتوں کو سچ جان کر بھی ایسے کر رہا ہے، تو کیوں؟ میرے خیالات سے لوگ کتراتے ہیں اور بولتے ہیں کہ تم غلط سوچتے ہو، مگر اندر ہی

اندر اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ جو میں بول رہا ہوں، وہ سچ ہے۔ تو ایسی دو نمبری کیوں کرنی پڑ رہی ہے؟ وہ میرے ساتھی بن کر ان چیزوں کے خلاف کیوں نہیں ہوتے جن کے خلاف ہونے کی ضرورت ہے؟

2025/12/29

آج میں پورے اکیس سال کا ہو گیا ہوں۔ آج سے اکیس سال پہلے، انتیس دسمبر کو، رات تقریباً دس بجے کے قریب میں پیدا ہوا تھا۔ میری پیدائش گھر پر ہوئی تھی۔ میرے لیے سالگرہ کا دن شروع سے ہی کوئی خاص دن نہیں رہا۔ ہمیشہ یہ دن میرے لیے عام دنوں سے بھی زیادہ عام رہا ہے۔

اگر میں یاد کرنے کی کوشش کروں تو مجھے بہت کم ہی اپنی سالگرہ پر کوئی تحفہ ملا ہو۔ مجھے زندگی میں تحفے ویسے ہی بہت کم ملے ہیں، اور سالگرہ پر تو شاید اور بھی کم۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ میری سالگرہ اپنے دن منائی ہی نہیں گئی، اگلے دن جا کر منائی گئی، اور یہ بات مجھے شروع سے بہت بری لگتی ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جو لوگ مجھے وِش کرتے ہیں وہ بھی کتنا دل سے کرتے ہیں، یہ تو سوشل میڈیا کا کمال ہے کہ وہ زیادہ لوگوں سے جڑنے کا ذریعہ ہے۔ میرے کنٹیکٹس میں تقریباً ایک ہزار کے قریب نمبر ہیں، مگر مجھے شاید پچاس لوگوں نے ہی وِش کیا ہو گا۔ ان میں سے بھی تقریباً چالیس نے محض بوجھ سمجھ کر یہ رسمی فریضہ ادا کیا ہے، صرف دس لوگوں نے دل سے کیا ہو گا۔

تحفہ تو انہوں نے بھی نہیں دیا۔ مجھے تحفے کا کوئی لالچ نہیں ہے، مگر ایک خوشی ضرور ہوتی ہے، اور میں اکثر اس خوشی سے محروم رہا ہوں۔ اگر مجھے کوئی تحفے میں ایک چاکلیٹ بھی دے دے تو میں خوش ہو جاتا ہوں۔ کیا میری اتنی سستی خوشی بھی بوجھ ہے؟

اسی لیے میں نے اپنے بارے میں ایک بات سیکھی ہے کہ مجھے اپنے لیے خود تحفہ لینا چاہیے، اسے پیک کروانا چاہیے، اور اپنے آپ کو خود وِش کرنا چاہیے۔ باقی لوگوں کا بوجھ مجھے بھی ویسے ہی اتار کر پھینک دینا چاہیے جیسے انہوں نے میرا بوجھ اتار کر احسان کیا ہے۔

اس موقع پر میں موت کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ ظاہر ہے، پیدا ہوا ہوں تو مرنا بھی ہے، اور موت وہ حقیقت ہے جو تمام لذتوں کو ختم کر دینے والی ہے۔ مجھے رشک آتا ہے ان لوگوں پر جن کی سالگرہ پر انہیں ڈھیر سارے تحفے ملتے ہیں، مگر ان میں ایک بات مجھے بہت بری لگتی ہے کہ ان میں اکثر لوگ بے دل ہوتے ہیں۔

مجھے وہ لوگ بھی یاد رہتے ہیں جن کی سالگرہ کبھی منائی ہی نہیں جاتی۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں ایسے لوگوں کی سالگرہ ان کے ساتھ مناؤں، ان کے لیے تحفہ خریدوں، انہیں دوں، اور انہیں یہ احساس دلاؤں کہ سالگرہ کی خوشی کیا ہوتی ہے، کہ تم خوش ہو کیونکہ تم پیدا ہوئے۔

مجھے وہ لوگ بھی یاد ہیں جو زندگی سے تنگ آ چکے ہیں، جو خودکشی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ میرے ساتھ اکیلے اپنی سالگرہ مناؤ۔ میں تمہیں زندگی جینے کی وجہ بتاؤں، میں تمہیں بتاؤں کہ جس چیز سے تم تنگ ہو وہ دراصل کتنی قیمتی ہے۔ میرے ساتھ ایک دن گزارو، میں تمہیں زندگی کا مقصد سمجھاوں۔

2025/12/31

آج 2025 کا آخری دن ہے۔ آج کے بعد یہ سال کبھی کسی کی زندگی میں واپس نہیں آئے گا۔ اس سال میں نے بہت کچھ سیکھا، بہت بہت مسائل کا سامنا کیا، اور اس کے آخری دن اس کو الوداع کہنے کا وقت آ گیا ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں: اے 2025، تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے بہت کچھ سکھایا، مجھے بڑا کیا، میری سوچ کو ایک وسعت دی، مگر تم سے گلہ بھی رہے گا۔ تم نے مجھے بہت ساری چیزوں میں الجھا بھی دیا۔

ایک بات کہوں جو تمہیں نہیں پتا، وہ یہ ہے کہ دنیا میں جیسے میں الجھا ہوا ہوں، ویسے ہی دنیا میرے بارے میں بھی الجھی رہے گی۔ مجھے کوئی قبول نہیں کرتا۔ مجھے ڈاکٹر کہتے ہیں تم وکیل اچھے ہو، وکیل کہتے ہیں تم ڈاکٹر اچھے ہو، کمپیوٹر سائنس والے کہتے ہیں تمہارا یہاں کوئی کام نہیں، میتھ والے، ہسٹری والے سب الگ الگ جگہ کا مشورہ دیتے ہیں۔

میرے بڑے کہتے ہیں تم گمراہ ہو گئے ہو، اور نئے کہتے ہیں تم بزرگوں کی سوچ والے ہو۔ مگر میں کیا ہوں، یہ بس میں جانتا ہوں، اور شاید مجھے سمجھنے والے جلد آنے والے نہیں۔ مجھے سمجھنا کوئی اتنا آسان کام بھی نہیں۔

اس میں قصور میرا نہیں، لوگوں کی سوچ کا ہے کہ وہ میرا احاطہ نہیں کر پا رہے۔ میں آنے والے کئی زمانوں تک سب کی سوچ پر ایک ہتھوڑے کی طرح بجوں گا۔ میں سو سال بعد بھی لوگوں کی سوچ کو اسی طرح متاثر کروں گا جیسے آج کر رہا ہوں۔

میرے معاملے میں دو طرح کے لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔ ایک وہ جو چپ کر جائیں گے، جو خاموشی سے میری بات سن لیں گے، اور دوسرے وہ جو میری باتوں کو حقیقت میں سمجھ جائیں گے۔ باقیوں کے لیے یہ فیصلہ کرنا ہمیشہ مشکل رہے گا کہ وہ مجھے کس جگہ رکھیں، اچھا جانیں یا برا۔

بس میں تو اپنے بارے میں یہ کہوں گا: تھا بھی میں، اب ہوں بھی میں۔

روز صبح اٹھنا، اسکول چلے جانا،
کالج چلے جانا، یونیورسٹی چلے جانا،
کام پر چلے جانا، کھانا پینا اور پھر
سو جانا — یہ بھی بھلا کوئی
زندگی ہے؟ ایسی زندگی تو جانور
بھی گزار رہے ہیں، بلکہ ہم سے اچھی
گزار رہے ہیں۔ ایک پھول کم از کم
کھلتا تو ہے، اور وہ تو خوشبو بھی
دیتا ہے۔ ہم تو وہ بھی نہیں کھلتے، ہم
سے آتی بھی ہے تو صرف بدبو۔
اسی لیے .....
بچہ بن کر زندگی گزارو
ورنہ زندگی آپ کو گزار دے
گئی

عبدالمعیظ